طلوعِ اسلام

اکتوبر
۱۹۵۲

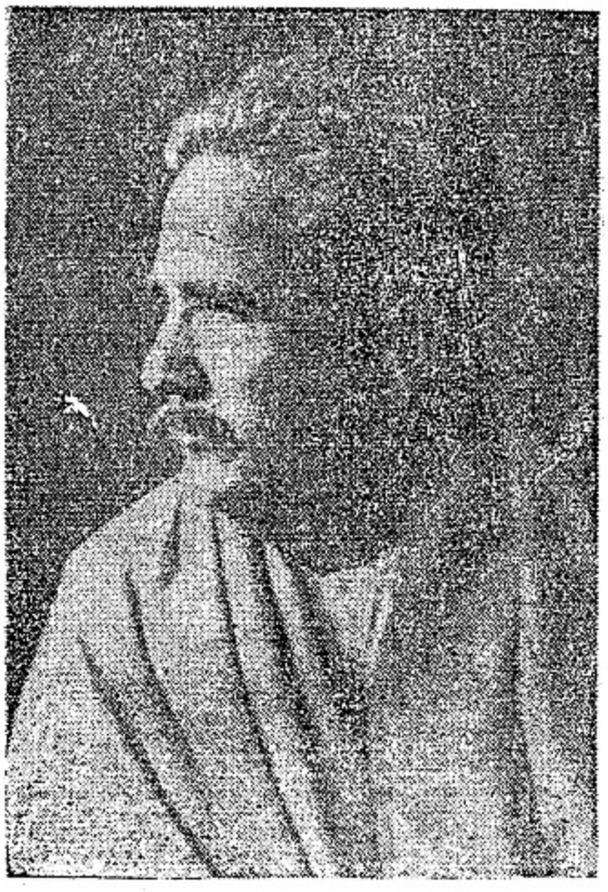

-/10/-

طلوعِ اسلام کا مسلک و مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ:-

(۱) تنہا فکرِ انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کیلئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح انسانی آنکھ کو روشنی کی۔

(۲) یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اسلئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

(۳) حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

(۴) حضور نبی اکرمؐ، انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں بہت سی ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضورؐ کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

(۵) قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان، ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

(۶) اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں (انھیں قوانین شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

(۷) اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا (اسے ربوبیتِ عامہ یعنی "تمام نوعِ انسانی کی پرورش" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔)

(۸) ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کیلئے (قرآن کی رو سے) ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظامِ ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ

ابتداءً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں، قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی دبی ہوئی صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور اس طرح

"زمین اپنے پروردش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے!

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کیلئے قسم قسم کا مال موجود ہو، اور

خریداری کا فیصلہ

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ تسلی کر لیں کہ قیمت واجبی ہے اور

آپ کا اطمینان

اسوقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا مال ویسا ہی نکلا

آپ یونہی پریشان نہ ہوجئے

ہمارے ہاں آئیے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔

ہمارے ہاں ہر قسم کا ہوزری کا سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمرسیٹ سٹریٹ، کراچی

پرچون کے لئے — الفنسٹن سٹریٹ، کراچی

تشریف لائیے

نیاز آگین: ایچ غلام محمد اینڈ برادرز۔ کراچی

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ

جلد ۵	اکتوبر سنہ ۱۹۵۲ء	نمبر ۹

فہرست مضامین

طلوع اسلام کا مسلک اور مقصد ۳

لمعات ۵ - ۹

لبیک ۱۰ - ۱۵

(محترم پرویز صاحب)

قانون حجب ۱۶ - ۱۷

(علامہ اسلم جیراجپوری صاحب)

اثر بہار (نظم) ۱۸

(اسد ملتانی صاحب)

دستورِ پاکستان ۱۹ - ۳۱

مُلّا کی قرآن فہمی ۳۲ - ۴۲

ایک عام اعتراض ۴۳ - ۵۱

حقائق و عبر ۵۲ - ۵۹

(۱) نبوت جدیدہ

(۲) وہی مرجبی وہی عنتری

(۳) مذہبی جنون

باب المراسلات ۶۰ - ۶۱

(جمع قرآن)

نقد و نظر ۶۲ - ۶۷

(۱) اسلام کی بنیادی حقیقتیں

(۲) خوش حال خاں خٹک

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اواخر اگست میں پاکستان کے گورنر جنرل محترم غلام محمد صاحب نے ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کراچی کو مخاطب کرتے ہوئے جو تقریر فرمائی تھی اس کا وہ حصہ جو اسلام سے متعلق ہے ان حضرات کے لئے قابل فکر و توجہ ہے جو پاکستان کے مستقبل سے سنجیدگی کے ساتھ دلچسپی رکھتے ہیں انھوں نے فرمایا:۔

اکثر لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم زندگی کے معاملات میں مذہب کو بہت زیادہ دخیل کر رہے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اسلام ایک جامد مذہب کا نام ہے جو ارتقاء انسانیت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ گذشتہ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصہ میں اسلام نے استبداد کے ہاتھوں بڑا نقصان اٹھایا ہے۔ ہوا یہ کہ ان مستبد حکمرانوں نے اسلام کو بطور ایک آلۂ کار کے استعمال کیا۔ مفاد پرست گروہ ان کے ساتھ تھا اور مذہبی پیشوا (علماء) ملوکیت اور مفاد پرستی کے منشاء کے مطابق اسلام کی تاویلات کرتے جاتے تھے اور چونکہ یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہی لوگ مذہب کے واحد ٹھیکہ دار ہیں اسلئے جو کچھ یہ کہتے ہیں وہی مذہب بن جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک کھلی ہوئی کتاب ہے جسے ہر شخص خواہ وہ کوئی مولوی ہو یا سرکاری دفتر کا ملازم بلا کسی روک ٹوک کے از خود پڑھ سکتا ہے۔ خدا کا احسان ہے کہ ہمارے ہاں ذات پات کی کوئی تمیز نہیں نہ ہی ہمارے ہاں کوئی پنڈتوں کا گروہ ہے اور نہ ہی اس قسم کا تصور کہ اس گروہ کے باہر باقی لوگ ذہنی طور پر اچھوت ہیں۔ میں اس پلیٹ فارم سے پوری جرأت اور وضاحت کے ساتھ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اسلام زندگی کے ہر شعبہ میں ہمارے اور آپ کے تصور سے کہیں زیادہ مساوات کا حامی ہے۔

اب کرنے کا کام یہ ہے کہ اس ہزار سالہ عرصہ میں اسلام مستبد ملوکیت اور مفاد پرستانہ پیشوائیت کے جس ملبہ کے نیچے دب چکا ہے اسے وہاں سے نکالا جائے۔ جب وہ اسلام سامنے آئیگا تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا پیغام کس قدر صاف اور واضح انسانی حریت فکر اور تصور جمہوریت کے مطابق اور دنیا کے بلند ترین تصورات سے ہم آہنگ ہے۔

لیکن اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ وہی اسلام صحیح ہے جو آج ہم میں مروج ہے اور جو ہزار سالہ استبداد اور مفاد پرستی کی تخلیق ہے تو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان میں اس قسم کے ملوکیت کی استبداد یا پیشوائیت کی خدائی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ ہم حریت فکر و نظر کے قائل ہیں اور تمام انسانوں کیلئے زندگی کے ہر شعبہ میں یکساں مواقع بہم پہنچانے کے حامی ہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کا کام یہ ہے کہ وہ لوگوں میں ان بلند اقدار کی روح پھونک دیں جنھیں قرآن پیش کرتا ہے اور جن کے بغیر کوئی قیادت اخلاقی اور روحانی ترقی نہیں کر سکتی۔

(ڈان — ۲۹ اگست ۱۹۵۲ء)

جس دلخراش اور جگر سوز حقیقت کی طرف اوپر کے الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے طلوع اسلام اسے مسلسل اور متواتر پانچ برس سے دہراتا چلا آرہا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس پر غلط عقیدت مندیوں اور ابلہ فریب مفاد پرستیوں کی ہزار چادریں بھی پردہ نہیں ڈال سکتیں کہ جو اسلام اسوقت پاکستان ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں مروج ہے اسے اس اسلام سے دور کا بھی تعلق نہیں جسے اللہ نے نوع انسانی کی رہنمائی کے لئے نازل کیا اور جسے رسول اللہ صلعم نے انسانوں تک پہنچایا۔ آج کا اسلام ان عجمی سازشوں کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں کو ان کی قوت کے حقیقی سرچشمہ ـــــ قرآن کریم ـــــ سے بیگانہ بنانے کیلئے ہمارے دورِ ملوکیت میں بروئے کار آئیں اور جنھوں نے پورے کے پورے اسلام کو غیر اسلامی تصورات سے بدل دیا۔ یہ اسلام، پیشوائیت (ملائیت) کی مفاد پرستی کے سہارے قائم ہے اور ان کے پاس اس کے سچا ہونے کی دلیل اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ہمیں ہمارے اسلاف سے ورثہ میں ملا ہے۔ ذرا اس دلیل پر غور کیجئے۔ مثلاً ہمارے دور کے "علماء حضرات" اپنے پیش کردہ اسلام کی حقانیت کی کوئی ایسی دلیل اپنے پاس نہیں رکھتے جسے فی ذاتہ دلیل کہا جا سکے۔ لیکن یہی علماء جن کی تہی دامنی کا یہ عالم ہے آئندہ آنے والی نسل کیلئے "اسلاف" بن جائیں گے اور بطور سند اور دلیل پیش کئے جائیں گے۔

محترم غلام محمد صاحب نے یہ تو فرما دیا کہ ہمیں اصل اسلام کو اس غیر اسلامی ملمہ کے نیچے سے نکالنا ہوگا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس کے نکالنے کی شکل کیا ہوگی۔ ہمارے سامنے یہ مقصد عظیم تشکیل پاکستان سے بہت پہلے سے تھا۔ تحریک پاکستان سے ہماری وابستگی کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ ہم سمجھتے تھے کہ اس خطۂ زمین میں حقیقی اسلام کو از سر نو ایک زندہ قوت بنانے کے مواقع میسر آجائیں۔ ہم دیکھتے تھے کہ باقی ممالک اسلامیہ میں ملوکیت اور پیشوائیت کی مفاد پرستانہ قوتیں اس قدر جڑ پکڑ چکی ہیں کہ وہاں حقیقی اسلام کے احیاء کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس کے برعکس پاکستان کو ایک جدید مملکت بننا تھا اس لئے اس میں یہ امکانات تھے کہ ہم جس انداز کی حکومت چاہیں قائم کر سکیں۔ لیکن پاکستان میں کچھ اور ہی نقشہ بنتا دکھائی دے رہا ہے۔

تقسیم ہند کے بعد مولوی صاحبان کی ایک کثیر تعداد ہندوستان سے پاکستان کی طرف آگئی۔ پاکستان کی مساجد اور مکاتب پہلے ہی سے آباد تھے اس لئے اس نو وارد جماعت کیلئے معاش کا مسئلہ بڑا پیچیدہ بن گیا۔ اس اہم شق کی طرف نہ حکومت نے توجہ کی نہ قوم نے۔ نتیجہ یہ کہ جس طرح پختہ ساحل نہ بنانے کی وجہ سے نہریں اور دریا اپنا رخ آپ متعین کر لیتے ہیں اس نو وارد سیلاب نے بھی اپنی معاش کے راستے خود پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ ممکن ہے اس سیلاب کا رخ مسجدوں اور مکتبوں کی طرف ہی رہتا لیکن کچھ حالات اس قسم کے پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے ان کی نگاہیں مسجد کے منبروں سے اٹھ کر حکومت کی کرسیوں تک جا پہنچیں۔ سب سے پہلے مسٹر اسد لیو پولڈ نے اپنے دستوری خاکے میں یہ تجویز پیش کی کہ مملکت پاکستان میں علماء کی ایک سپریم کونسل (مجلس اعلیٰ) بنائی جائے جن کے اختیارات مقننہ اور انتظامیہ دونوں سے بلند اور وسیع ہوں۔ اس کے بعد اسلامی جماعت کے ارباب حل وعقد نے اس مضرعہ کو اٹھایا اور زمام حکومت و قیادت "صالحین" کے ہاتھوں میں دیدینے کی تحریک کا آغاز کیا۔ ان کی بات ارباب شریعت کے دل کو بھی لگتی تھی۔ ہر طرف سے اس کی تائید میں آوازیں بلند ہونی شروع ہو گئیں۔ "اسلامی شریعت کا نفاذ" ایک ایسا سلوگن تھا جو عوام کو اپنی طرف کھینچ لینے کی بڑی جاذبیت اپنے اندر رکھتا تھا چنانچہ انھوں نے ایک طرف تو عوام کو اس طرح اپنے پیچھے لگایا اور دوسری طرف ارباب حل وعقد کی کلبوں کی زندگی اور ان کی

بیگمات کی بے پردگی کی داستانوں کو سرِعام دہرا دہرا کر انھیں (Demoralise) کرنے کی مہم شروع کر دی۔ اور اس مہم میں اتنی شدت اور تیزی پیدا کر دی کہ ان کے حریف سچ مچ (Demoralised) ہونا شروع ہو گئے۔ اور انھوں نے اپنی خیریت اسی میں سمجھی کہ عوام کی ہمنوائی میں یہ کہدیا جائے کہ پاکستان کا دستور شریعت اسلامی کے مطابق ہوگا۔ حالانکہ ان کے ذہن میں اس امر کا کوئی تصور نہیں تھا کہ اسلامی شریعت کسے کہتے ہیں اور وہ کن عناصر پر مشتمل ہے۔ اسی گھبراہٹ کا نتیجہ تھا وہ قرارداد مقاصد جو ان کی پریشان خیالیوں کی خود آئینہ دار ہے۔ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ پاکستان کی کانسٹی ٹیوشن شریعت اسلامیہ کے مطابق ہوگی لیکن جو کچھ اس میں کہا گیا ہے اسے نہ کانسٹی ٹیوشن سے کوئی تعلق ہے نہ اسلامی شریعت سے۔ لیکن ان کی یہ بدحواسی فریقِ مقابل کی یقینی کامیابی ثابت ہوگئی۔ انھوں نے اس قرارداد اور اس کے بعد ذمہ دار ارباب حکومت کے مختلف بیانات و اعلانات کو مضبوط پکڑ لیا اور اس طرح ارباب بست وکشاد پر خود ان ہی کے حربوں سے نئے حملے شروع کر دیئے۔

ہمارا خیال ہے کہ پاکستان کی دستور سازی میں جو تاخیر واقع ہوئی ہے اس کی بنیادی وجہ یہی کشمکش تھی۔ دستور بنانے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس پیچیدگی کا حل کیا ہو۔ وہ اپنے ہاتھوں سے دی ہوئی گرہ کو اپنے دانتوں سے کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں ناکام رہے ہیں اور غالباً مُلّا کے سامنے غیر مشروط ہتھیار ڈال دیں گے۔ اس کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ ذمہ دار ارکان میں کچھ لوگ ایسے ہیں جنھیں مذہب پرست کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی مذہبیت بعینہٖ وہی ہے جسے مُلّا پیش کر رہا ہے وہ مروجہ مذہب کے پابند ہیں اور اسی کو صحیح اسلام سمجھ رہے ہیں اس لئے ان کے نزدیک مُلّا کا مطالبہ حق بجانب ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انھیں یہ دشواری نظر آتی ہو کہ اس قسم کا شرعی نظام موجودہ زمانے کے سیاسی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا لیکن اس کا حل بھی چنداں مشکل نہیں۔ ہماری شریعت خود ہمارے بادشاہوں کی پیدا کردہ ہے جس کی رو سے شریعت کا دائرہ نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ تک محدود رہتا ہے اور امور سلطنت سے اسے کچھ واسطہ نہیں ہوتا جس طرح انھوں نے اپنے ساتھ علماء کی جماعت کو رکھ چھوڑا تھا اسی طرح اب بھی کیا جا سکتا ہے یعنی علماء کی ایک کونسل بنالی جائے اور مساجد، مکاتب، اوقاف، زکوٰۃ وغیرہ کے محکمے ان کی تحویل میں دیدیئے جائیں۔ اور شخصی قانون (پرسنل لاء) سے متعلقہ امور میں ان سے فتوے لیلیے جایا کریں۔ باقی رہے امور سلطنت سو اس کے لئے حکومت موجود رہے گی۔ یہی انداز باقی اسلامی ممالک میں رائج ہے اور اس کے لئے ہمارے پاس اسلاف کی سند بھی موجود ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس میں مختلف فرقوں کے علماء بھی متفق ہو جائیں گے۔ (کیونکہ اس میں معاشی مشکلات کا حل بھی مل جاتا ہے اور ان کے نزدیک شریعت سے مقصود بھی فقط اتنا ہی ہے) اور حکومت کو بھی اس سے آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ علماء کا بند عوام کا سیلاب تھامنے کیلئے ہمیشہ مفید ثابت ہوا ہے۔ قرائن سے مترشح ہوتا ہے کہ اب جو یہ کہا جا رہا ہے کہ دستور پاکستان بہت جلد مرتب ہو جائے گا تو اس کی غالباً یہی وجہ ہے کہ اس دشواری کا حل تجویز کر لیا گیا ہے جو تدوین دستور کی راہ میں حائل تھی اور یہ حل اغلباً وہی ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔

اگر ہمارا یہ اندازہ صحیح ہے تو آسمان کو چاہیئے کہ اس پر جتنا بھی رونا چاہتا ہے رو لے کیونکہ اسلامی ممالک میں صحیح اسلام کے احیاء کی جو مدھم سی کرن نظر آتی تھی وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاہلیت کے ان دبیز پردوں کے پیچھے چھپ جائے گی اور اس کے ساتھ ہی

اہل پاکستان کو بھی اپنا سر پیٹ لینا چاہیئے کہ ان کی حالت بھی چند دنوں کے بعد ویسی ہی ہو جائے گی جیسی افغانستان، عراق اور دیگر اسلامی ممالک کی ہے۔ قرآن نے یہودیوں کے متعلق کہا تھا کہ یُخْرِبُونَ بُيُوتَهُم بِأَيْدِيهِمْ کہ وہ اپنے گھر اپنے ہاتھوں سے تباہ کر رہے ہیں۔ آج یہی چیز کس طرح پاکستان کے مسلمانوں پر صادق آرہی ہے۔ خدا نے انھیں ایک آخری موقعہ دیا تھا کہ وہ اپنے گھروں کو زندگی کی خوش گواریوں اور شادابیوں سے معمور کر لیں لیکن یَا وَیْلَنَا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں سے اپنے کاشانوں کو ویرانوں میں تبدیل کرنے کی سوچ رہے ہیں۔

اے محمدؐ گر قیامت را برآری سر زخاک　　سر برآر و ایں قیامت درمیان خلق بیں

لیکن ان قرائن و شواہد کے بالکل برعکس محترم غلام محمد صاحب کی وہ تقریر ہے جس کا اقتباس اوپر دیا گیا ہے۔ محترم موصوف پاکستان کے گورنر جنرل ہیں اسلئے ہمیں باور کرنا چاہیئے کہ انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے پوری پوری ذمہ داری سے فرمایا ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ پاکستان کا گورنر جنرل یہ نہیں چاہتا کہ جو کچھ آج اسلام کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے وہ مملکت پاکستان کا دستور اور قانون بن جائے۔ وہ چاہتا یہ ہے کہ صحیح اسلام کو اس غیر اسلامی ملبہ کے نیچے سے نکالا جائے اور اسی کو پاکستان کا آئین اور قانون بنایا جائے۔ جیسا کہ انھوں نے خود فرمایا ہے یہ اسلام قرآن کے اندر ہے اور ہمارے پاس قرآن اپنی اصلی شکل میں موجود ہے اسلئے پاکستان کے دستور اور قانون کو صحیح اسلامی بنیادوں پر تشکیل کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔ بات بالکل آسان ہے۔ قرآن کے اصولوں کو سامنے رکھئے اور ان کی روشنی میں اپنے لئے دستور اور قانون خود مرتب کیجئے۔ یہی منشائے خداوندی ہے اور یہی صحیح اسلام کا مقصود ہے اس میں نہ کسی پیشوائیت کی گنجائش ہے نہ غیر اسلامی عناصر کے راہ پانے کا کوئی امکان ہے۔ ایسا کرنے کیلئے فقط اس جرأت کی ضرورت ہے جو صحیح ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔

ہمارا اندازہ ہے کہ اب پاکستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس خیال کے مؤید ہیں کہ صحیح اسلامی دستور اور قانون کی تدوین کی وہی صورت ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ ہم ان لوگوں سے درخواست کریں گے کہ وہ پاکستان کے گورنر جنرل محترم غلام محمد صاحب کی تقریر کے حوالہ سے انھیں لکھیں کہ وہی دستور اور قانون اسلامی ہو سکتا ہے جسے پاکستان کے اہل الرائے حضرات باہمی مشاورت سے قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں خود مرتب کریں۔ اس کیلئے کسی مولوی کی ضرورت نہیں۔ یہ وقت ہے کہ اس آواز کو بلند کیا جائے ورنہ اگر ایک دفعہ ملائیت اپنی تنگ نظریوں کو لئے ہوئے کسی طرح بھی اقتدار کی کرسیوں پر متمکن ہو گئی تو پھر قرآن کا نام لینا آسان نہیں رہے گا۔ یہ بہت بڑا خطرہ ہے جو پاکستان کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ اگر اس خطرہ کو دور کرنے کے لئے اس وقت چارہ جوئی نہ کی گئی تو اس کے بعد اس کا استیصال بہت مشکل ہو جائے گا۔ غور کیجئے کہ یہ خطرہ اس خطرہ سے کم نہیں جو باہر کی قوتوں کی طرف سے پاکستان کو مٹانے کیلئے ہر وقت گھات میں لگا رہتا ہے۔

لیکن جو لوگ قرآن کی صداقت اور ابدیت پر محکم ایمان لا چکے ہیں ان کیلئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ خطرہ بیشک بڑا ہے لیکن ایمان کا امتحان بھی تو خطروں ہی میں ہوا کرتا ہے۔ اگر انھوں نے تھوڑی سی بھی ہمت کر لی تو قرآن کی داخلی قوت جس کی تائید انھیں حاصل ہے باطل کی ان عنکبوتی دیواروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھدیگی۔ صاحب ضرب کلیمؑ کا ایک عصا ساحروں کی ہزاروں نگاہ فریب رسیوں پر بھاری ہوتا ہے۔

خطرات کی ان گھٹاٹوپ تاریکیوں میں دور کی ایک آواز ہے جو بار بار ہمارے کانوں میں کہہ رہی ہے کہ اگر پاکستان کے مسلمانوں کو برباد کرنا ہی مقصود ہوتا تو پاکستان کبھی وجود ہی میں نہ آتا۔ اتنی بڑی مخالفتوں کے علی الرغم پاکستان کی تشکیل خود اس امر کی دلیل ہے کہ اسے حقیقی اسلام کی تجربہ گاہ بننا ہے اور ایسا ہو کر رہے گا ولو کرہ المشرکون۔ تمام ممالک اسلامیہ میں صرف پاکستان ہی وہ خطہ ہے جہاں اس وقت قرآن کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ ملوکیت اور پیشوائیت کو خود زمانہ کے تقاضے مٹا رہے ہیں۔ پاکستان میں اس کی حرکت مذبوحی اسے کتنے دنوں تک زندہ رکھ سکے گی۔ سوال صرف یہ ہے کہ قرآن پر ایمان رکھنے والے قرآن کو از سر نو ایک زندہ قوت بنانے کیلئے کیا کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ان کے امتحان کا وقت قریب تر آ رہا ہے۔

قرآنی دستور کا ذکر آنے سے ذہن اُس بحث (Conterovers y) کی طرف منتقل ہو گیا جو آج کل کراچی کے اخبار "ڈان" میں چل رہی ہے اور جس میں کراچی کے ایک صاحب نے ایک دوسرے صاحب کو یہ چیلنج دیا ہے کہ اگر وہ قرآن کی ایسی آیات پیش کر دیں جن کے مطابق پاکستان کا دستور مرتب کیا جا سکتا ہے تو وہ انھیں پانچ ہزار روپیہ انعام دیں گے۔ ہمیں نہ تو اس اخباری بحث سے دلچسپی ہے اور نہ اس پانچ ہزاری چیلنج سے لیکن قارئین طلوع اسلام میں سے بعض حضرات نے ہمیں لکھا ہے کہ ہمیں اس چیلنج کا جواب دینا چاہئے کیونکہ ہم تو قرآنی دستور کے طالب اور داعی ہیں۔ یہ سطور محض ان حضرات کے استفسار کے جواب میں سپرد قلم کی جا رہی ہیں۔

ویسے تو طلوع اسلام قرآن کی روشنی میں دستور اساسی کے متعلق شروع سے لکھتا چلا آ رہا ہے لیکن اس نے نومبر ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں حکومت پاکستان کی قرارداد مقاصد اور بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ پر ایک تفصیلی تبصرہ کیا تھا اور اس کے بعد قرآنی اصولوں کی روشنی میں ایک پورے دستور کا خاکہ مرتب کر کے حکومت کو بھی بھیجا تھا اور طلوع اسلام فروری ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں شائع کر دیا تھا۔ قارئین طلوع اسلام میں سے جنھیں کچھ شبہ ہو یا جو مزید وضاحت چاہتے ہوں وہ ہم سے پوچھ لیں کہ اس دستوری خاکہ کی فلاں شق کی تائید میں قرآن کی کونسی آیت ہے۔ اس طرح ان کا اطمینان ہو جائیگا کہ دستور پاکستان کس طرح قرآنی اصولوں کی روشنی میں مرتب ہو سکتا ہے۔

اور اگر کوئی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ وہ مذکورہ بالا بحث کو کسی آخری نتیجہ تک پہنچائیں تو اس کے لئے صحیح فکری طریق یہ ہے کہ پہلے مستفسر سے یہ کہا جائے کہ وہ اس کی وضاحت کرے کہ کانسٹی ٹیوشن کسے کہتے ہیں، اس کے حدود و فرائض کیا ہیں اور وہ کن مسائل سے بحث کرتی ہے؟ جب وہ اس قسم کی وضاحت کر دیں (اور انھیں ہر تفصیل کے لئے سند بھی دینی ہو گی تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کانسٹی ٹیوشن کا یہ تصور خود ان کے اپنے ذہن کا نہیں بلکہ ان لوگوں کا متعین کردہ ہے جو اس موضوع پر (Authority) سمجھے جاتے ہیں) اس کے بعد یہ سوال پیدا ہو گا کہ کانسٹی ٹیوشن کی ان تفاصیل کے متعلق قرآن کریم سے کوئی رہنمائی مل سکتی ہے یا نہیں اور اگر مل سکتی ہے تو وہ کیا ہے۔ بحث کو کسی نتیجہ تک پہنچانے کے لئے یہی صحیح اور سنجیدہ طریق کار ہے۔

لبّیک

پرویز

از نہانخانۂ دل خوش غزلے می خیزد
سرِ شاخے ہمہ گویم بہ قفس نتواں گفت

قریب بیس سال کا عرصہ ہوگیا جب میں نے اپنی قرآنی فکر کو اربابِ بصیرت کے سامنے پیش کرنے کی ابتدا کی تھی۔ شروع شروع میں ایسا محسوس ہوتا تھا گویا یہ آواز یکسر صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہے۔ فضا نامساعد، ماحول ناسازگار، کان اس آواز سے ناآشنا اور طبائع اس سے نامانوس۔ ہر سوچنے والے دماغ کے لئے یہ حقیقت بڑی حیرت انگیز ہے کہ مسلمان قرآن پر اپنا ایمان رکھتے ہیں لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہاری زندگی کا نصب العین یہی قرآن ہے تو اس آواز کی اس شدت سے مخالفت ہوتی ہے گویا کوئی انھیں گمراہی اور بیدینی کی طرف بلا رہا ہے اور ان کی متاعِ دین و ایمان ان سے چھینی جا رہی ہے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو قرآنی فکر کی طرف دعوت دینا بڑا صبر آزما اور ہمت شکن مرحلہ تھا۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ قوم میں جو غیر قرآنی تصورات صدیوں سے متوارث چلے آ رہے ہیں اور اس طرح ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکے ہیں۔ انھیں اعماقِ قلب سے نکال کر ان کی جگہ قرآنی تصورات کو جاگزین کرانا، ایک دن کا کام نہیں۔ اسلئے میں نے، محض بتوفیقِ ایزدی، اس آواز کو جاری رکھا۔ مبدا فیض کی عاجز نوازیوں نے میری اس حقیر سی کوشش کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور رفتہ رفتہ کان اس آواز سے مانوس اور قلوب اس سے آشنا ہونے شروع ہو گئے۔ یہ محض اُس کا کرم بے پایاں ہے جس نے آج مجھے یہ کہنے کے قابل بنا دیا ہے کہ

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں　　　یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

فالحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً۔

یہی نہیں کہ کان اس آواز سے مانوس ہو گئے بلکہ اب ایک عرصہ سے کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ مجھے چاروں طرف سے تقاضے موصول ہو رہے ہیں کہ قرآنی فکر کی عام اشاعت کا وسیع پیمانے پر انتظام ہونا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی اس فکر کو عملی شکل دینے کے لئے بھی کوئی پروگرام بنانا چاہئے۔ اس وقت ان تقاضوں کی شدت کا یہ عالم ہے کہ شاید ہی کوئی ڈاک ایسی ہو جس میں دو چار خطوط اس موضوع پر نہ ملتے ہوں اور شاید ہی کوئی ملنے والا ایسا ہو جس کی ملاقات کم و بیش انہی الفاظ پر ختم نہ ہوتی ہو۔ یہی ہیں وہ تقاضے جن کی ترجمانی محترم عرشی صاحب نے اپنے ایک مقالہ میں کی ہے جس میں (میرے مضمون "اسبابِ زوالِ امت" کا تعارف کراتے ہوئے) انھوں نے لکھا ہے کہ

اب تصنیفوں، تقریروں اور ماضی وحال کی حسرتناک یادوں اور ماتم انگیز سینہ کوبیوں سے آگے بڑھ کر قرآن پسند لوگوں کی ایک مجلس عاملہ مرتب کرنی چاہیئے جو اپنا تعلیمی اور عملی لائحہ مرتب کرے اور اپنا ایک مرکزی مقام تجویز کرکے وہاں سے آغاز کار کرے۔

اور اس کے بعد مجھ سے تخاطب کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ

قوم کا روشن فکر طبقہ اس وقت ایک نئے سرسید کے لئے بیتاب ہے جو بغیر کسی دعوے کے اٹھے اور ان کے ایثار وعمل سے کام لے کر ایک بالکل نئی قرآنی نسل تیار کردے۔ (البیان۔ اپریل ۱۹۵۲ء)

[عرشی صاحب نے اپنے مقالہ میں میرے متعلق جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کے لئے میں ان کا شکرگذار ہوں۔ یہ بھی درحقیقت اللہ کا احسان ہے کہ وہ کسی کے متعلق اس کے رفقاء کے دل میں نیک خیالات پیدا کردے] اس تذکرہ سے مقصود یہ بتانا تھا کہ مختصر الفاظ میں تقاضا یہ ہے کہ مجھے اب اپنا پورا وقت اس مقصد کی تکمیل کے لئے وقف کردینا چاہیئے جسے میں اسوقت تک ضمناً کرتا چلا آرہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان تقاضوں نے اب ایسی نوعیت اختیار کرلی ہے کہ اس موضوع پر مجھے ذرا کھل کر گفتگو کرنی چاہیئے۔

سب سے پہلے میں اس "راز" کا افشا کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تقاضے مجھے باہر ہی سے موصول نہیں ہورہے بلکہ ایک عرصہ سے خود میرے اپنے اندر سے بھی یہی تقاضے اٹھ رہے ہیں۔ اور ان داخلی تقاضوں کی شدت، خارجی تقاضوں سے کچھ کم نہیں۔ لہذا آج کی گفتگو کا جذبۂ محرکہ خارجی تقاضوں کے علاوہ، یہ جانسوز کیفیت بھی ہے کہ

از سینہ تا بچند برآرم فرو برم — ایں نیم قطرہ خوں کہ زمژگاں چکیدنی است

مجھے ملازمت کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے پچیس تیس برس کا عرصہ ہوگیا اور قریب قریب اتنی ہی مدت میری قرآنی فکر کی ہے۔

اس پورے پچیس تیس سال کے عرصہ میں (جو زندگی کا بیشتر حصہ ہے) میری کیفیت مسلسل یہ رہی ہے کہ (علامہ اقبال کے الفاظ میں)

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں — کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

اس میں کوئی شبہ نہیں (اور اسے محض بطور تحدیث نعمت عرض کررہا ہوں) کہ میں نے جب بھی کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا یا کچھ کہنے کے لئے زبان کھولی تو سوائے ایک اللہ کی قوت کے کسی دوسری طاقت کا (خوف تو ایک طرف) خیال تک بھی میرے سامنے نہیں آیا۔ لیکن بایں ہمہ، یہ دونوں زندگیاں (حصول معاش کی پابندیاں اور قرآنی فکر کی جولان گاہیں) ایسی تھیں جن میں نباہ پیدا کرنے کے لئے ایک مسلسل کاوش درکار رہی اور یہ احساس قدم قدم پر سامنے رہا کہ "جام و سنداں باختن" کے لئے فی الواقعہ بڑی جگر کاوی کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس زندگی کی ہر صبح کا آغاز اس جانکاہ احساس سے ہوتا کہ

جانم درآویخت با روزگاراں — جوئے است نالاں در کوہساراں

اور ہر شام کا اختتام اس آرزو کے ساتھ کہ

طبعے بلند دادہ بند ز پائے من کشا — تا بہ پلاس می وہم خلعت شہریار را

سب سے شدید احساس جو اس دوران میں باعث سوہانِ روح بنتا رہا یہ تھا کہ اگر وہ تمام وقت جو حصولِ معاش کے لئے صرف کرنا پڑتا ہے پیش نظر مقصد کے لئے وقف ہو سکتا تو یہ کام کتنی جلدی تکمیل تک پہنچ جاتا۔ لیکن یہ تمام پابندیاں میری خود عائد کردہ تھیں اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ میں نے شروع ہی سے اپنے سامنے ایک اصول رکھا تھا اور وہ یہ کہ میں اپنی قرآنی فکر کو اپنا ذریعۂ معاش نہیں بناؤں گا۔ اس پچیس تیس سال کے عرصہ میں جس قدر کشاکش رہی اسی اصول کی وجہ سے رہی۔ ایسے کئی مواقع آئے جہاں جذبات کی رَو اس قدر تیز ہو گئی کہ جی چاہا کہ ان بندھنوں کو توڑ کر پورا وقت اسی مقصد کے لئے وقف کر دوں۔ لیکن ان مقامات پر میرا دامن جس خیال نے پکڑ لیا وہ بھی اپنی اہمیت اور عبرت آموزی کے لئے کچھ کم وقیع نہ تھا۔ بہت سے احباب ایسے تھے جن کے متعلق مجھے ذاتی طور پر علم تھا کہ اُنھوں نے نہایت اخلاص اور دیانت کے ساتھ اپنے آپ کو "ملی مقاصد" کے لئے وقف کر دیا۔ لیکن چونکہ ان کے ذریعۂ معاش کی کوئی الگ صورت موجود نہ تھی (اور ہماری قوم نے کبھی اس طرف توجہ ہی نہیں دی کہ جو لوگ اس قسم کے اجتماعی مقاصد کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں اُنھیں روٹی کی بھی ضرورت ہوتی ہے)۔ اس لئے ان میں سے بعض کی صورت تو یہ ہو گئی کہ وہ سچ مچ بھوکوں مر گئے۔ اور جو بھوک کو برداشت نہ کر سکے انھیں محض روٹی کی خاطر وہ کچھ کرنا پڑا جس کے تصور سے روح کانپتی ہے۔

بنابریں (اس احساس کے باوجود کہ میری زندگی کا ایک خاصا حصہ دفتر نے لے لیا) میرا قلب مطمئن ہے کہ میرا فیصلہ صحیح تھا۔ اور میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر دوسروں کو بھی یہی مشورہ دوں گا کہ ہماری قوم کے موجودہ حالات کے پیش نظر جن میں ان لوگوں کی معاش کا کوئی اجتماعی انتظام نہیں جو اپنے آپ کو اجتماعی مفاد کی خاطر وقف کر دیں، کسی شخص کو اجتماعی مفاد کے میدان میں نہیں آنا چاہئے جب تک اس کی معاش کا اطمینان بخش ذریعہ الگ موجود نہ ہو۔ جو ایسا کریگا یا تو خودکشی پر مجبور ہو جائیگا یا دین فروشی پر۔

یہ تو تھا اس سوال کا جواب کہ میں نے اپنی زندگی کا اتنا حصہ ملازمت میں ضائع کیوں کر دیا۔ پورا وقت قرآنی فکر کی نشر و اشاعت اور اس کے عملی نظام کی تشکیل میں کیوں صرف نہیں کیا۔ اب رہا مستقبل کے متعلق۔ سو صورت یہ ہے کہ ایک تو میری صحت ایسی نہیں رہی کہ زیادہ وقت تک اس دُہرے بوجھ کو اٹھا کر چل سکوں۔ اور دوسرے یہ کہ اب میں ملازمت میں اس مقام تک آ پہنچا ہوں جہاں مجھے اتنی پنشن مل سکتی ہے کہ باقی عمر معاش کی طرف سے بے فکر ہو جاؤں۔ لہٰذا اب میں اپنی عمر کا باقی حصہ اس مقصد کی تکمیل کی خاطر وقف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم علیہ توکلت والیہ انیب۔

مستقبل کے لئے میرے سامنے حسب ذیل امور ہیں۔

(۱) قرآنی فکر کی عام اشاعت اس وقت تک میری قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کا ذریعہ مجلۂ طلوع اسلام رہا ہے۔ لیکن یہ ایک محدود ضخامت کا ماہوار رسالہ ہے اور زندگی کے مسائل اسقدر گوناگوں اور حالات کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ ایک ماہوار مجلہ اس ضرورت کو پورا کر ہی نہیں سکتا۔ اس کیلئے کم از کم ہفتہ وار جریدہ تو ہو۔

نیز اس وقت تک اس فکر کی اشاعت صرف اردو داں طبقہ تک محدود رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ انگریزی زبان (اور اس کے ساتھ اسلامی ممالک کو بھی شامل کر لیا جائے تو عربی اور فارسی) میں بھی اس کی اشاعت کی جائے۔ دنیا میں اسوقت قرآن کی آواز کہیں سے بھی بلند نہیں ہو رہی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی، دیکھنے والی نگاہیں یہ بھی دیکھ رہی ہیں کہ دنیا اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے نظاہائے زندگی سے تنگ آکر ایک ایسے نظام کی تلاش میں دیوانہ وار پھر رہی ہے جو صرف قرآن سے مل سکتا ہے۔ اس لئے اگر اس وقت دنیا کے سامنے قرآنی نظام پیش کیا جا سکے تو اس کی بڑی توقع ہے کہ کاروانِ انسانیت صحیح راستے پر چل نکلے۔ اس کیلئے ایک مرکز کی ضرورت ہے جہاں سے یہ فکر ساری دنیا میں پھیلائی جا سکے۔

رسائل اور جرائد کے علاوہ اس کی بھی بڑی ضرورت ہے کہ قرآنی فکر سے متعلق عام لٹریچر شائع کیا جائے اور اسے گھر گھر پہنچایا جائے۔

ان مقاصد کے لئے ایک پبلشنگ ہاؤس (ادارۂ نشر و اشاعت) کی اشد ضرورت ہے۔

(۲) معارف القرآن کی تکمیل اس وقت تک معارف القرآن کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں (لیکن اس کی پہلی تین جلدیں اس وقت ملتی نہیں)۔ پانچویں جلد زیرِ تسوید ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ (i) زندگی کے مسائل کیا ہیں۔ (ii) کیا ان مسائل کو تنہا عقلِ انسانی حل کر سکتی ہے؟ اور (iii) اگر عقل انسانی انھیں حل نہیں کر سکتی تو قرآن ان کا حل کیا تجویز کرتا ہے یعنی اس میں ان کوششوں کا تذکرہ بھی ہے جو انسانی فکر، زندگی کے مسائل حل کرنے میں آج تک کر چکی ہے اور اس کے بعد قرآن کی طرف سے پیش کردہ حل بھی۔

اس کے بعد (اگلی جلدیں) اسلامی نظام (سیاسی، معاشرتی، معاشی وغیرہ) کی تفصیل اور اس کا مقابلہ دیگر نظاہائے عالم سے ہوگا۔

اس کے بعد کی جلدیں، فقہ قرآنی ہوگی۔ یعنی قرآنی قوانین و ضوابط کا تفصیلی تذکرہ۔

اور آخری جلد میں آخرت کا قرآنی تصور، اخروی زندگی اور اس کے تضمنات۔ موت۔ برزخ۔ قیامت۔ اعراف۔ بہشت۔ دوزخ۔ زندگی کی ارتقائی منازل و منتہیٰ کا قرآنی تصور۔

یہ ہے میرے پیشِ نظر اس قرآنی انسائیکلوپیڈیا کا نقشہ۔

(۳) قرآن کا لغت اور ترجمہ میں اس حقیقت کا اظہار کئی بار کر چکا ہوں کہ ہمارے ہاں کی قرآنی تفاسیر اور تراجم، عجمی تصورات کے ترجمان ہیں۔ قرآن کو سمجھنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآنی الفاظ کے معانی اس عربی زبان کی رو سے متعین کئے جائیں جو زمانۂ نزولِ قرآن میں مروج تھی۔ بدقسمتی سے اس قسم کی کوئی کوشش اس سے پہلے نہیں ہوئی، اسی لئے قرآن نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ اس کے لئے ہمیں خود قرآن کریم اور زمانہ نزولِ قرآن کے تمام لٹریچر کو کنگھالنا ہوگا جو کسی ایک جگہ مدون نہیں۔ اس طرح مفرداتِ قرآن کے معانی متعین کر کے ایک لغت مرتب کیا جائے، اور ان معانی کے مطابق قرآن کریم کا ترجمہ کیا جائے۔ یہ لغت اور ترجمہ صحیح قرآن سامنے لے آئیگا اور ذہن کو ان تمام غیر قرآنی تصورات سے پاک اور صاف کر دیگا جو ہماری تفاسیر نے اس طرح عام کر رکھے ہیں یہ بہت بڑا کام ہے لیکن اس کے نتائج اس سے بھی بڑے ہوں گے۔

(۴) اسلام کی تاریخ مسلمانوں کی نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ۔ یعنی اس امر کی تاریخ کہ رسول اللہ نے کونسا اسلام پیش کیا اور

وہ اسلام کس طرح اس اسلام میں تبدیل ہوگیا جو آج ہمارے ہاں مروج ہے اور جسے اصلی اسلام سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کے لئے یہ بتانا ہوگا کہ یہ غیر اسلامی عناصر کہاں کہاں سے چل کر اسلام میں داخل ہوگئے اور انھیں کن کن کوششوں سے اسلام میں داخل کیا گیا۔

(۵) نصابِ تعلیم ایک ایسے نصاب کی تدوین جس سے بچوں کے قلب و نگاہ کی تعمیر صحیح قرآنی بنیادوں پر ہوسکے اور وہ زندگی کے مسائل کا عملی حل قرآن کی روشنی میں دریافت کرنے کے قابل ہوسکیں۔

ظاہر ہے کہ ان امور کی تکمیل کے لئے ایک تحقیقاتی ادارہ (قرآنک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ) کی ضرورت ہوگی جس میں قرآنی فکر رکھنے والے صاحبانِ علم و تحقیق مل کر کام کریں گے۔

(۶) قرآنی بستی میرے پیش نظر یہ بھی ہے کہ ایک ایسی بستی بسائی جائے جس میں قرآنی نہج کے مطابق زندگی بسر کرنے کے متمنی حضرات آکر بسیں۔ یہ بستی خود کفیل اور خود مکتفی ہو اور اس نظام کی جھلک پیدا کرے جو قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے تجویز کرتا ہے۔

(۷) قرآنی درسگاہ اور سب سے آخر یہ کہ ایک ایسی درسگاہ قائم کی جائے جس میں قرآن اور علوم حاضرہ کی تعلیم اس انداز سے دی جائے کہ اس کے فارغ التحصیل طالب علم نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے قرآنی نظامِ زندگی کو مشرق اور مغرب دونوں کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوں۔ یعنی سرسید نے ہمیں اس قابل بنا دیا تھا کہ ہم دنیا کے سامنے اپنی بات پیش کرنے کے اہل بن جائیں۔ اور ہم آئندہ نسلوں کو اس قابل بنا دیں کہ وہ دنیا کے سامنے قرآن کی بات پیش کرسکیں۔

یہ ہیں میرے نزدیک کرنے کے کام۔ اس پروگرام کو دیکھنے کے بعد جو لوگ یہ کہہ کر مسکرا دیں کہ "یہ سب ایک خیالی انسان (IDEALIST) کے ناممکن الحصول تصورات ہیں"، ان سے ہمیں کچھ سروکار نہیں۔ لیکن جو حضرات یہ سمجھیں کہ یہ تصورات وہ ننھے ننھے بیج ہیں جن سے بڑے بڑے تناور درخت پیدا ہوسکتے ہیں، وہ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ کام نہ میرے اور نہ کسی اور کے تنہا کرنے کے ہیں۔ ان کے لئے اجتماعی کوششوں کی ضرورت ہے۔ میں اس مقصدِ عظیم کے لئے اپنی زندگی وقف کرسکتا ہوں ——— چہ کند بے نوا ہمیں دارد ——— لیکن میرے زندگی وقف کردینے سے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہوجائے گا۔ اس کیلئے تو بڑے سامان کی ضرورت ہوگی۔ زمین، مکانات، پریس، لائبریری، کام کرنے والوں کی جماعت۔ اور ان سب کے لئے سرمایہ۔

اب سوال ہے ان حضرات سے جو اس قرآنی فکر سے ہم آہنگ اور اس لائحہ عمل سے اصولاً متفق ہیں، کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے کیا کرسکتے ہیں؟ یہ ظاہر ہے کہ جس حد تک یہ اجتماعی کوشش نتیجہ خیز ہوگی اسی حد تک یہ پروگرام عمل میں لایا جاسکیگا اس لئے ان حضرات کے لئے یہ لمحہ بڑے اہم فیصلے کا ہے۔ نہ صرف ان حضرات کے لئے بلکہ خود قرآنی نظام کی تحریک کے لئے بھی یہ لمحہ بڑا اہم ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اسی سے ایک ایسے نقطہ کا آغاز ہوجائے جو آخر الامر ساری دنیا میں قرآنی فکر کو عام کرنے اور قرآنی نظام کے قائم کرنے کا محیط افزا دائرہ بن جائے۔ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء۔ اور اس طرح آپ وہ

السابقون الاولون بن جائیں جن کے پیچھے پیچھے کاروانِ انسانیت، رشد و سعادت کی اس راہ پر چل پڑے جو کامرانیوں اور خوشگواریوں کی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔

اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا جواب متعین۔ واضح اور غیر مشروط ہونا چاہئے۔ کیونکہ مجھے انہی جوابات کی روشنی میں اس پروگرام کے متعلق آخری فیصلہ کرنا ہوگا۔

میرے مخاطب تو صرف وہی حضرات ہیں جنھیں مجھ پر اعتماد ہے۔ لیکن میں نے اس گفتگو کو نجی طور پر اپنے احباب تک ہی اس لئے محدود نہیں رکھا کہ مقصد پیش نظر صرف میرا یا میرے ذاتی احباب کا مقصد نہیں۔ یہ مشترکہ مقصد ہے ان تمام حضرات کا جو قرآنی فکر و نظام کے عام کرنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ (اور اس اعتبار سے میرے احباب بھی درحقیقت یہی حضرات ہیں) انہی کی خاطر میں اس گفتگو کو منظر عام پر لے آیا ہوں تاکہ کسی کو یہ شکایت نہ رہے کہ اس میں اُسے شرکت کا موقعہ نہیں دیا گیا۔

مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ والسلام

پرویز

پتہ، ۲۳/۱ فاولر لائن۔ نیپیئر بارکس۔ کراچی

معاملہ کی باتیں

(۱) خط و کتابت میں اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ عدم تعمیل کی شکایت نہ فرمائیے۔

(۲) رسالہ ہر ماہ پانچ تاریخ کو حوالۂ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر آپ کو بروقت پرچہ نہیں ملا تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا پرچہ محکمۂ ڈاک کی غفلت سے ضائع ہوگیا۔ اسلئے پندرہ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیدیجئے۔

(۳) ڈاک خانہ کی طرف سے رسالہ کی روانگی کے لئے ۵، ۱۰، ۲۰، ۳۰، تاریخیں مقرر ہیں، ان تاریخوں کے علاوہ ہم دوسری کسی تاریخ میں پرچہ نہیں بھیج سکتے اگر آپ نے دفتر کو کوئی شکایت تحریر فرمائی ہے تو تعمیل کے لئے ان تاریخوں کا انتظار فرمائیے۔

(۴) اگر آپ کا چندہ ختم ہوگیا ہے تو دفتر سے آپ کو ایک جوابی کارڈ بھیجدیا گیا ہے اس کا فوری جواب دیجئے۔ اگر آپ جواب نہیں دے رہے تو آئندہ پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی حاضر ہوگا جس کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہے۔

(۵) ادارۂ طلوع اسلام ایک تبلیغی ادارہ ہے۔ وی پی منگا کر واپس کر دینا اخلاقی جرم کے علاوہ ایک تبلیغی ادارہ کو نقصان بھی پہنچانا ہے۔

(۶) اگر آپ رسالہ کے ایجنٹ ہیں اور آئندہ آپ رسالہ کی ایجنسی جاری رکھنا نہیں چاہتے تو یکم تاریخ سے پہلے پہلے ادارہ کو اطلاع دیجئے اور بلا وجہ ادارہ کو نقصان نہ پہنچائیے۔

آپ کا مخلص منیجر

ادارۂ طلوع اسلام۔ رابسن روڈ۔ کراچی

قانونِ حجب

(علامہ اسلم صاحب جیراجپوری)

جولائی کے رسالہ طلوع اسلام میں مولانا تمنا صاحب، کا مضمون عنوان بالا سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے اگرچہ میرا نام نہیں لیا ہے مگر اعتراضات میرے ہی اوپر کئے ہیں۔ میں نے سورۂ نساء کی آیت ۱۲ — وَاِنْ کَانَ رَجُلٌ یُّوْرَثُ کَلٰلَۃً الآیہ — کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فقہ فرائض میں اس آیت سے جو اخیافی بھائی بہن کو ذوی الفروض قرار دیا گیا ہے صحیح نہیں ہے بلکہ اس میں عہدی وارثوں کے حصے بیان کئے گئے ہیں جن کا ذکر اسی سورہ کی آیت ۳۳ میں ہے۔

والذین عقدت ایمانکم فآتوھم نصیبھم

جن سے تمہارا عہد ہو گیا ہو ان کو ان کے حصے دو

مولانا تمنا نے یہاں تک تو مجھ سے اتفاق کیا ہے کہ اس میں اخیافی بھائی بہن کے حصے جو فقہا نے قرار دیئے ہیں صحیح نہیں ہیں مگر اس سے اختلاف کرتے ہیں کہ یہ عہدی ورثہ کے حصے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ باپ ماں کی موجودگی میں یہ مطلق بھائی بہن کے حصے ہیں مگر دلیل اس پر سوائے اپنے قیاس کے اور کچھ نہیں دیتے۔ میرے اور ان کے درمیان متنازع فیہ صورت یہ ہے:

حمید نے وفات پائی۔ باپ کو چھوڑا اور دادا کو۔ ماں کو چھوڑا اور نانی کو۔ اور اپنے باپ ماں کی ایک بیٹی سعیدہ اور ایک بیٹے مسعود کو چھوڑا جو اس کے حقیقی بہن بھائی ہیں۔ مولانا تمنا باپ کو دادا کا حاجب قرار دیتے ہیں اور ماں کو نانی کا۔ یعنی باپ کی موجودگی کی وجہ سے دادا کو وراثت نہیں ملے گی اور ماں کی موجودگی کی وجہ سے نانی کو۔ مگر یہی باپ اور ماں ان کے نزدیک اپنی بیٹی سعیدہ اور بیٹے مسعود کے حاجب نہیں ہو سکتے۔ مولانا ان کو حصہ دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس لئے یہاں ان سے چند سوالات کرنے ضروری ہیں۔

(۱) آپ باپ ماں کی موجودگی میں بھائی بہن کو کس قرآنی دلیل سے حصے دیتے ہیں؟

(مولانا موصوف نے دراصل یہاں قیاس سے کام لیا ہے۔ فرماتے ہیں "باپ ماں کی موجودگی میں بھائی اور بہن، ماں کا حصہ $\frac{1}{3}$ سے $\frac{1}{6}$ کر دیتے ہیں مگر ان کو خود اس سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ ان کو ایک حبہ مل سکتا ہے۔ اس لئے مولانا صاحب نے رحم کھا کر ان کے بھی حصے مقرر فرما دیئے۔ لیکن یہ نہ سوچا کہ بلا قرآنی سند کے یہ حصے دیئے کیسے جائیں گے۔)

(۲) سورۂ نساء کی آخری آیت میں بھائی بہن کے حصے اولاد کی طرح (نر کو مادہ سے دگنا) رکھے گئے ہیں مگر اس بارہویں آیت میں تو مذکر اور مونث کے حصے مساوی ہیں۔ اگر بقول مولانا تمنا صاحب یہاں بھی بھائی اور بہن ہی کے حصے ہیں تو تقسیم میں فرق کیوں ہے؟

(۳) قرآن نے پورے قانون وراثت کو صرف پانچ آیتوں میں بیان فرمادیا ہے۔ ان میں کلالہ کا لفظ دو جگہ آیا ہے۔ آپ نے کس دلیل سے ایک جگہ کلالہ ناقص اور دوسری جگہ کلالہ کامل مراد لیا ہے۔ ایسے نازک اور مختصر قانون سازی کے موقع پر ایک ہی لفظ کے دو معانی کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ خیال رکھئے کہ آپ کا قیاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۴) آیت ۳۳ میں آپ نے عقدتمین کا ترجمہ عقد نکاح کیا ہے۔ یہ ثبوت طلب ہے۔ یہ سوچنے کی بات ہے کہ بارہویں آیت میں میاں اور بیوی کے حصے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں۔ پھر آیت ۳۳ میں پہنچکر یہ فرمانا کہ جن سے تم نے عقد نکاح باندھا ہے ان کو ان کے حصے دیدو کیا معنی رکھتا ہے۔ میرے خیال میں مولانا صاحب اس آیت سے بھی سرسری گزر گئے ہیں انھوں نے یہ سوچا نہیں کہ یہ کس ضرورت سے یہاں لائی گئی اور کیا فائدہ دیتی ہے جو اس سے پہلے ہم کو حاصل نہیں تھا۔

(۵) آپ نے فرمایا ہے کہ غیر وارث اگر وارث بنایا جائے تو اس کیلئے باب افعال نہیں بلکہ باب تفعیل ہے۔ اس پر کوئی سند نہیں دی۔ نہ قرآن کی کوئی آیت پیش کی جس میں یہ لفظ باب تفعیل سے لایا گیا ہو۔ بخلاف اس کے متعدد آیات میں اس کا استعمال باب افعال ہی سے ہوا ہے۔ مثلاً سورہ شعراء میں ہے اورثنا ھا بنی اسرائیل۔ سورۂ احزاب میں ہے واورثکم ارضھم ودیارھم۔ سورۂ فاطر میں ہے ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

دراصل یہ خود ساختہ قاعدہ مولانا نے اپنی غلطی کی حمایت کیلئے وضع فرمایا ہے مگر یہ نہ صرف عربی زبان بلکہ قرآن پر ظلم ہے۔

ان سب غلطیوں کی وجہ یہ ہے کہ مولانا تمنا نے قرآنی وراثت سمجھنے میں جو پہلا قدم رکھا وہی غلط رکھا۔ قرآن نے نسبی رشتہ داروں کی وراثت کا سب سے پہلا بنیادی قاعدہ جو بتایا ہے وہ یہ ہے: للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون۔ وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون ـــــ مردوں کو حصہ ملے گا اس مال میں سے جو ان کے باپ ماں یا کسی اقرب نے چھوڑا ہے اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس مال میں سے جو ان کے باپ ماں یا کسی اقرب نے چھوڑا ہے۔ یعنی نسبی رشتہ دار باپ۔ ماں اور اقرب کے سوا اور کسی کے ترکہ سے حصہ نہیں پاتا۔ اقرب کا مفہوم میں نے اپنے رسالہ محجوب الارث میں جو اس سے پہلے طلوع اسلام میں چھپ چکا ہے واضح کر دیا ہے کہ مورث اقرب اس کا ہوگا جس سے بلا واسطہ اس کا رشتہ ہے اور اگر بواسطہ ہے تو بروقت مورث کی وفات کے وہ واسطہ مفقود ہو۔ میں نے دلائل سے ثابت کر دیا ہے کہ اس کے سوا اقرب کا کوئی دوسرا مفہوم ہو نہیں سکتا۔ اب صورت متنازع فیہ کو ملاحظہ فرمائیے۔ حمید متوفی سعیدہ اور مسعود کا نہ باپ ہے نہ ماں، نہ اقرب ہے۔ کیونکہ اس کا رشتہ ان دونوں بھائی بہن کے ساتھ بذریعہ باپ اور ماں کے ہے جو دونوں موجود ہیں۔ پھر وہ دونوں حمید کے ترکہ سے حصہ کیسے پا سکتے ہیں؟ مولانا نے یہ پہلا قدم غلط رکھا اس لئے اس کے بعد جتنے قدم رکھے سب غلط در غلط در غلط ہوتے گئے۔

اثرِ بہار

فقط انقلابِ موسم کو میں کیا کہوں بہاراں
جو اثر پذیر اس سے نہ ہوا مزاجِ یاراں

نہ کسی نے جام اٹھایا، نہ پیا نہ کچھ پلایا
ہوا کیا جو ابر آیا بہ مُرادِ مے گُساراں

یہ سہی چمن کا نقشہ، ہے مگر چمن یہ کیسا
نہ تبسّم اس میں گُل کا نہ ترنّم ہزاراں

ہیں طیور وقفِ شیون، گُل و لالہ چاک دامن
ہے یہ بزمِ اہلِ گلشن کہ ہجومِ سوگواراں

مرے دل نے کیوں نہ مانا کہ بدل گیا زمانہ
وہی شاخِ آشیانہ وہی برق و باد و باراں

ہیں بلند جن کے دعوے کہوں کیا کہ ہیں وہ کیسے
کوئی نے سوار جیسے کرے نقلِ شہسواراں

یہ جو رنگِ زُہد کا ہے میں بتا تو دوں کہ کیا ہے
مگر اس سے روکتا ہے ادبِ بزرگواراں

اثرِ بہار پیدا دلِ زندہ ہی کرے گا
نہ نشیبِ دشت و دریا نہ فرازِ کوہساراں

دلِ مطمئن ملا ہے تو یہ نعمتِ خدا ہے
تجھے کیا خبر کہ کیا ہے تب و تابِ بیقراراں

اسد ملتانی

دستور پاکستان

(فقہ حنفی)

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

ہم نے طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت میں یہ لکھا تھا کہ جو لوگ مذہب کو اپنی انتخابی مہموں کی آڑ بنا کر پاکستان میں نظام شریعت کا مطالبہ کرتے ہیں ان کی ٹکنیک یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اکثریت کو اپنے ساتھ رکھیں کیونکہ دور حاضرہ کے جمہوری قاعدوں کی رو سے انتخاب میں وہی جماعت کامیاب ہو سکتی ہے جس کے ساتھ اکثریت ہو۔ اس مہم میں اسلامی جماعت سب سے پیش پیش ہے۔ یہ جماعت آج تک کتاب و سنت اور قرآن و حدیث کو اسلامی دستور کا مدار علیہ قرار دیتی چلی آ رہی تھی۔ ان کے اس دعوے میں قرآن کا نام تو محض برائے بیت ہوتا تھا، اصل زور حدیث پر دیا جاتا تھا۔ یہ لوگ حدیث کو وحی غیر متلو قرار دیکر اسے قرآن کے ہم پایہ ٹھہراتے تھے اور اس کا مسلسل اعادہ کرتے چلے آتے تھے کہ قانون صرف کتاب و سنت کے اندر ہے چنانچہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنے مضمون "تجدید و احیائے دین" کا خاتمہ ان الفاظ پر کیا تھا؛

کبھی تجدید ملت کیلئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی تنہا ماخذ تھیں

> لہذا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ہی وہ تنہا ماخذ ہے جس سے اس دور میں تجدید ملت کا کام کرنے کیلئے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے اور اس راہ نمائی کو اخذ کر کے اس وقت کے حالات میں شاہراہ عمل تعمیر کرنے کیلئے ایسی مستقل قوت اجتہادیہ درکار ہے جو مجتہدین سلف میں سے کسی ایک کے علوم اور منہاج کی پابند نہ ہو۔ اگرچہ استفادہ ہر ایک سے کرے اور پرہیز کسی سے بھی نہ کرے۔
>
> (ترجمان القرآن صفحہ ۳۴۶ دسمبر ۱۹۴۰ء و جنوری ۱۹۴۱ء)

اسی طرح وہ اپنے پمفلٹ "اسلامی قانون" میں لکھتے ہیں کہ

> اسلامی قانون میں جو چیز اٹل ہے وہ تین اجزاء پر مشتمل ہے۔ (۱) قطعی اور صریح احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں دیئے گئے ہیں۔ (۲) اصولی احکام جو قرآن یا ثابت شدہ احادیث میں بیان ہوئے ہیں۔ (۳) حدود جو قرآن و سنت میں اس غرض کے لئے مقرر کی گئی ہیں کہ ہم اپنی آزادیٔ عمل کو ان کے اندر محدود رکھیں ...... اسلامی قانون کا یہ اٹل اور قطعی واجب الاطاعت حصہ ہی دراصل وہ چیز ہے جو اسلامی تہذیب و تمدن کے حدود اربعہ اور اس کی مخصوص امتیازی شکل و صورت کو متعین کرتا ہے۔ (صفحہ ۲۲)

حتی کہ وہ تفہیمات حصہ اول میں لکھتے ہیں کہ

تمام ائمہ بالاجماع کہتے ہیں کہ جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنت رسول اللہ روشن ہو جائے اس کے لئے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔ (ص ۳۲۵)

آج اکثریت کا فیصلہ ہی تنہا ماخذ ہے

یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جبکہ پورا برِ عظیم ہند انگریز کے پنجۂ استبداد میں جکڑا ہوا تھا اور انھیں اپنا منتہائے ارتقا امامت و مجددیت (مذہبی پیشوائیت) میں نظر آرہا تھا۔ جبکہ پاکستان کے وجود پذیر ہو جانے اور امیر المومنین بن سکنے کا انھیں وہم و خیال بھی نہیں تھا جس کے لئے جمہوری نقطۂ نظر سے انتخابی مہمیں لڑنے کی ضرورت تھی۔ لیکن پاکستان بن جانے کے بعد جبکہ انھوں نے انتخابی مہمیں لڑنے کا فیصلہ کیا اور اب جو اکثریت کو ساتھ رکھنے کی ضرورت پیش آگئی تو "دین" میں ضروری تبدیلی کر لی گئی چنانچہ اب (ترجمان القرآن بابتہ جون جولائی ۱۹۵۲ء میں) اس سوال کے جواب میں کہ پاکستان میں کونسا قانونِ شریعت نافذ ہوگا یہ لکھدیا گیا ہے کہ

> اگر شریعت کو ملک کا دستور اور قانون بنانا ہے (جس سے کوئی مسلمان انکار کی جرأت نہیں کر سکتا) تو جمہوریت کے مسلم قاعدہ کے مطابق یہاں شریعت کی وہی تعبیر دستور اور قانون کی شکل اختیار کریگی جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت معتبر مانتی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے اور اگر ان کے ساتھ اہل حدیث کو بھی شمار کیا جائے تو مجموعی تعداد نوّے فیصدی سے بھی زیادہ نکلیگی اس صورت میں لامحالہ دستور تو شریعت کی اس تعبیر کے مطابق ہی بنے گا جس پر حنفی اور اہلحدیث متفق ہوں اور لازماً ملکی قانون حنفی تعبیرِ شریعت پر مبنی ہوگا۔ (ص ۱۲-۱۳)

پہلے تو یہ دیکھئے کہ اس نئے مسلک میں کس سادگی اور پرکاری سے یہ کوشش کی گئی ہے کہ سردست اہلحدیث کو بھی ساتھ چپکائے رکھا جائے۔ اس کے لئے ارشاد ہے کہ مسلک کے دستور کی تعبیر تو حنفیوں اور اہل حدیث کے اتفاق سے طے پائے گی لیکن ملکی قانون فقہ حنفی کے مطابق ہوگا۔ حالانکہ دستور اور قانون کا ایک مبتدی بھی اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ کسی مملکت کا دستور ایک اصول کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا قانون اس اصول کے تابع وضع ہوتا ہے۔ دستور میں اس امر کی صراحت کی جاتی ہے کہ ملک کے قانون کا ماخذ یا منبع کیا ہوگا۔ قانون کے مسئلہ میں حنفیوں اور اہلحدیث کا اختلاف جزئی مسائل میں نہیں بلکہ اصول میں ہے۔ اندریں حالات یہ کس طرح ممکن ہے کہ پاکستان کا دستور تو حنفی اور اہلحدیث کی متفق علیہ تعبیر کے مطابق بنے اور اس کا قانون خالص فقہ حنفی کے مطابق ہو۔ اصل یہ ہے کہ یہ لوگ اس قسم کی باتیں کرنے کی جرأت اسلئے کر لیتے ہیں کہ یہ سمجھتے ہیں کہ بیچارے مولویوں میں کون ہے جو دستور اور قانون کے اس قسم کے باریک فرق کو محسوس کر سکیگا۔

جمہوریت کا اصول مسلم ہے

اب آگے بڑھئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ جمہوریت کا اصول مسلم ہے یعنی کسی مملکت کا آئین اور قانون وہی ہونا چاہئے جو اس مملکت کی اکثریت فیصلہ کرے۔ ظاہر ہے کہ اکثریت کا منشا معلوم کرنے کیلئے نظامِ جمہوریت میں ایک مشینری موجود ہوتی ہے جس کی رو سے مملکت کے نمائندے ایک جگہ بیٹھکر قانون بناتے ہیں۔ اسے مجلس قانون ساز یا پارلیمنٹ وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اس مجلس کے فیصلے (جو کثرتِ آراء سے طے پاتے ہیں) مملکت کا قانون بن جاتے ہیں۔ پاکستان میں اس قسم کی مجلس قانون ساز (کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی) آج بھی موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ آئین جمہوریت کے مطابق وہی قانون پاکستان کا مملکتی قانون قرار پائے گا جسے یہ مجلس منظور

کریگی. جب مودودی صاحب کی جماعت کے نزدیک جمہوریت کا قاعدہ مسلم ہے تو انھیں کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ خواہ مخواہ شور مچاتے پھریں کہ ملک کا قانون فلاں قسم کا ہونا چاہئے اور اگر اس قسم کا قانون نہ بنا تو وہ قابل قبول نہیں ہوگا۔ ایک طرف جمہوریت کے قاعدہ کو مسلم ماننا اور دوسری طرف جمہوریت کو مجبور کرنا کہ وہ ان کی مرضی کے مطابق قانون بنائے ایک ایسا مسلک ہے جسے کسی جمہوری نظام میں بھی مناسب تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیں حیرت ہے کہ جمہوریت کے قاعدہ کو ایک ایسا شخص مسلم قرار دے رہا ہے جو ایک ایسی جماعت کا امیر ہے جن کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اقامتِ دین کے لئے وجود میں آئی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ جمہوریت کا قاعدہ مغرب کی لادینی سیاست کی تخلیق ہے جن کے پاس غلط اور صحیح اور حق و باطل کے پرکھنے کا کوئی مستقل معیار نہیں۔ ان کے نزدیک اگر اکیاون[۵۱] اراکین یہ فیصلہ کر دیں کہ خدا کا وجود نہیں ہے تو انچاس اراکین کو ماننا پڑے گا کہ خدا نہیں ہے۔ ہم پوچھتے ہیں اسلامی جماعت کے امیر سے کہ کیا اسلام بھی اسی قسم کے قاعدہ کو مسلم تسلیم کرتا ہے؟ اگر محترم امیر جماعت اسلامی اجازت دیں تو ہم انھیں اتنا یاد دلانے کی جرأت کریں کہ آئینِ پاکستان کا جو مسودہ خود انھوں نے مرتب فرمایا ہے اس میں یہ شق موجود ہے:

> امیر کو حق ہوگا کہ وہ مجلس شوریٰ کی اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ اور امیر کو یہ حق بھی ہوگا کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ (دو دستوری خاکے ص۲۶)

کیا اصول جمہوریت اسی کو کہتے ہیں؟ اب جمہوریت کے مسلم قاعدہ کے مطابق مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا وہ وزن کہاں چلا گیا جس کے زور پر حنفیت کو پاکستان کا قانون بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے؟ حیرت ہے کہ یہ حضرات دین کے اصولی امور میں بھی اس قسم کی متضاد باتیں کہہ دیتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ان کے سر پر کتنی بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے حد ہمدردی کے قابل ہے وہ قوم جس میں اس قسم کے لوگ دینی امور میں سند بن کر بیٹھ جائیں۔

دین میں اکثریت کا وزن

مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ ملک کا قانون فقہ حنفی کے مطابق ہونا چاہئے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ملک کی اکثریت حنفی ہے۔ پہلے اس دلیل پر غور کیجئے۔ لیکن اس کے لئے پہلے ایک بنیادی نکتہ تمہیداً سمجھنا ضروری ہے۔ ایک مملکت (Secular State) کہلاتی ہے۔ اس کا اصول تعین یہ ہوتا ہے کہ جس بات کو مفید سمجھا جائے اُسے اختیار کر لیا جائے جسے نقصان رساں سمجھا جائے اسے چھوڑ دیا جائے۔ ان کے نزدیک غلط اور صحیح کا معیار اکثریت کی رائے ہوتی ہے۔ نہ کہ خدا کی طرف سے دیئے ہوئے غیر متبدل اصول۔ دوسری اسٹیٹ دینی کہلاتی ہے جس میں مملکت کے فیصلے ہمیشہ خدا کی طرف سے دیئے ہوئے غیر متبدل اصول کے تابع ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی مملکت دینی مملکت ہونی چاہئے۔ ایک مسلمان کا ایمان یہ ہے کہ اگر کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی خدا کے حکم کی خلاف ورزی کی جائے تو اس کا مواخذہ ہوگا۔ جب مسلمانوں کی مملکت کے قانون کا سوال سامنے آئے گا تو دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ قانون خدا کے حکم کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ مودودی صاحب یہ نہیں فرماتے کہ فقہ حنفی کو اس لئے اختیار کیا جائے

کہ وہ خدا کے احکام کے مطابق ہے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ اس فقہ کو اس لئے اختیار کیا جائے کہ ملک کی اکثریت اس کی متبع ہے۔ آپ سوچئے کہ یہ مسلک ایک سیکولر اسٹیٹ کا ہو سکتا ہے یا دینی مملکت کا؟

یہ تصور کہ اکثریت ہمیشہ حق پر ہوتی ہے انسان کی بہت بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے اور قرآن نے کھلے کھلے الفاظ میں اس کی تردید فرمائی ہے۔ جب رسول اللہ صلعم سے فرمایا:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ۔ (۶/۱۱۵)

اور اے رسول! اگر تم ان لوگوں کی اطاعت کرلو جو دنیا میں اکثریت میں ہیں تو وہ تمہیں خدا کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔ وہ محض ظن کی پیروی کرتے ہیں اور شک و گمان میں قیاس آرائیاں کرتے رہتے ہیں۔

دین میں اکثریت و اقلیت کوئی معیار ہی نہیں۔ جب رسول اپنی آواز کو بلند کرتا ہے تو اس کے حق میں صرف اس کا اپنا ووٹ ہوتا ہے اور پوری قوم کی اکثریت اس کے خلاف ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود رسول حق پر ہوتا ہے اور قوم کی اکثریت باطل پر۔

اکثریت کے وزن کے متعلق مودودی صاحب کی تصریحات

ہمیں اس اصول کے متعلق زیادہ تفصیل سے کہنے کی ضرورت نہیں اسلئے کہ مودودی صاحب نے متعدد مقامات پر اسے صحیح تسلیم کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب سیاسی کشمکش حصہ سوم میں "اقلیت و اکثریت" کے عنوان کے تابع لکھتے ہیں:

کثرت و قلت کا سوال صرف قوموں ہی کیلئے پیدا ہوتا ہے "جماعتوں" کے لئے نہیں، جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لیکر اٹھتی ہیں وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلت تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ (ص ۴۵۶)

یہاں تک تو صرف ایک اصولی بات کہی گئی اس کے بعد خود مسلمانوں کے متعلق سنئے۔ جن کی عظیم اکثریت کے وزن پر آج حنفیت کو قانونِ مملکت بنانے کی کوشش فرمائی جا رہی ہے۔ وہ عظیم اکثریت کس وزن کی حامل ہے سنئے۔ فرماتے ہیں:

ان وجوہ سے وہ عظیم الشان تعداد جو ہم کو مردم شماری کے رجسٹروں میں نظر آتی ہے اسلامی اغراض کیلئے قریب قریب بالکل بیکار ہو چکی ہے۔ (ص ۴۵۸)

آگے چلکر لکھتے ہیں:

بعض لوگ اس دھوکہ میں مبتلا ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کا نام "سوادِ اعظم" ہے اور نبی صلعم نے تاکید فرمائی ہے کہ سوادِ اعظم کا ساتھ ہمیشہ دو۔ لہٰذا مسلمانوں کی اکثریت جس سیاسی پارٹی کی حامی جس قیادت کی متبع ہے اس کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ لیکن یہ ارشادِ نبوی کی سراسر غلط تعبیر ہے۔ نبی صلعم نے جس سوادِ اعظم کے ساتھ رہنے کا حکم دیا ہے اس سے مراد دراصل ان مسلمانوں کی اکثریت ہے جن کے اندر اسلامی شعور موجود ہو جو حق اور باطل کی تمیز رکھتے ہوں اور جن کو اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے کم از کم اتنی واقفیت ہو کہ اسلام اور غیر اسلام میں فرق کر سکتے ہوں۔ (ص ۴۸)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں:

یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے نو سو ننانوے فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور

باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور نہ ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے اسلئے یہ مسلمان ہیں۔ انھوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دیکر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستہ پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابل داد ہے۔ (ص۲۷)

دین کا خود کوئی تصور نہ فی ذاتہ حق ہے نہ باطل

مودودی صاحب کے یہ ارشادات اس زمانے کے ہیں جب ہندوستان میں مسلم لیگ کی تحریک زوروں پر تھی اور یہ حضرت اس تحریک اور اس کے مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ ان سے کہا جاتا تھا کہ قوم کی اکثریت اس راہ پر چل رہی ہے اسلئے آپ بھی اس کا ساتھ دیجئے۔ اس وقت آپ یہ فرماتے تھے کہ اس قوم کی اکثریت کا وزن کیا ہے؟ اور آج وہی مودودی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ پاکستان میں فقہ حنفی اس لئے رائج کرنا چاہئے کہ یہاں کے مسلمانوں کی اکثریت اسے صحیح تسلیم کرتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی یہ اکثریت انہی افراد پر مشتمل ہے جو بقول مودودی صاحب کے پیدائشی طور پر مسلمان پیدا ہوئے ہیں اور جنھوں نے فقہ حنفی کو کسی غور و فکر کے بعد اختیار نہیں کیا بلکہ وہ محض اسلئے حنفی ہیں کہ حنفی ماں باپ کے گھر میں پیدا ہوئے۔ مگر یہی وہ اکثریت ہے جس کے مسلک کے متعلق آج یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اسے ایک دینی مملکت کا دستور اور قانون بنانا چاہئے۔ محض اس دلیل کی بنا پر کہ یہ اکثریت کا مذہب ہے۔ یعنی یہاں اتفاق سے حنفی اکثریت میں ہیں تو حنفیوں کا مذہب عین اسلام قرار دیا جا رہا ہے۔ اگر اہلحدیث اکثریت میں ہوتے تو ان کا مسلک عین اسلام قرار پاجاتا، اگر شیعہ اکثریت میں ہوتے تو اسی دلیل کی بنا پر ان کا مذہب، مذہب حق قرار دیا جاتا اور اگر کل کو کمیونسٹ اکثریت میں ہو جائیں تو ان کا مسلک ملک کا قانون قرار پانا چاہئے۔ یہ ہے دین کا وہ تصور جو جماعت اسلامی کے امیر کی طرف سے پیش کیا جا رہا ہے۔ یعنی دین کا کوئی خاص تصور یا فیصلے فی ذاتہ نہ حق ہیں نہ باطل۔ حق وہ ہے جسے کسی زمانہ اور کسی ملک کی اکثریت اختیار کرلے اور باطل وہ جو اس دور کی اقلیت کا مسلک ہو۔ اس دلیل کی بنا پر معلوم نہیں سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب آویزش کربلا کے متعلق کیا ارشاد فرمائیں گے کیونکہ وہاں تو امام حسینؓ اور ان کے ساتھی بالکل اقلیت میں تھے اور مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت یزید کے ہاتھ پر بیعت کر چکی تھی۔

فقہ حنفی کیا ہے؟

آیئے اب مختصراً یہ دیکھیں کہ فقہ حنفی کسے کہتے ہیں اور اس کے بعد یہ کہ (اس سے پہلے) خود مودودی صاحب اس فقہ کے متعلق کیا خیال رکھتے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم (بجز چند مستثنیات کے) اصولی احکام دیتا ہے۔ ان اصولی احکام کی جزئیات اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق متعین کی جاتی تھیں۔ سب سے پہلے ان جزئیات کو رسول اللہ صلعم نے متعین فرمایا۔ ظاہر ہے کہ کسی اصول سے جزئیات کے فیصلے تک پہنچنے کے لئے غور و فکر، رائے اور قیاس کی ضرورت ہے۔ اسی کا نام تفقہ فی الدین (دین میں غور و فکر کرنا) ہے اور اس طرح مستنبط کردہ احکام کا نام فقہ ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد اسلامی مملکت میں وسعت ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ہی جدید مسائل سامنے آتے گئے جن کے لئے نئے نئے فیصلوں کی ضرورت لاحق ہوتی رہی۔ صحابہؓ نے سنت رسول اللہؐ کی

اتباع میں (یعنی قرآنی اصولوں کی روشنی میں جزئی احکام کے تعین کے مسلک کی پیروی کرتے ہوئے) ان جدید مسائل کے لئے نئے نئے احکام نافذ فرمائے۔ ظاہر ہے کہ حالات کے بدلنے سے اس قسم کے فیصلوں میں بھی تبدیلی ہو سکتی تھی۔ نیز خود فیصلہ کرنے والے کی رائے کی تبدیلی سے بھی اس کے مستخرجہ نتائج میں تبدیلی کا امکان تھا۔ چونکہ فقہ کا مدار خارجی حالات اور مجتہد کی عقل و فکر پر تھا اس لئے اس قسم کے اختلافات میں کوئی قباحت نہیں سمجھی جاتی تھی چنانچہ خلافت راشدہ میں بعض فیصلے ایسے ہوئے جو رسول اللہ کے فیصلوں سے مختلف تھے اور اس کیلئے دلیل یہی دی گئی کہ جن حالات میں رسول اللہ نے ایسا فیصلہ دیا تھا اب وہ حالات بدل چکے ہیں اس کے بعد خود ایک خلیفہ نے اپنے پیشرو خلیفہ کے فیصلہ کے خلاف بھی فیصلے دیئے اور خود ایک ہی خلیفہ بھی مختلف حالات میں اپنے فیصلوں کو خود ہی بدلتا رہا۔ (ان امور کی مثالیں کتب سیر و تواریخ میں عام طور پر مل سکتی ہیں) خلافت راشدہ کے بعد دین میں لامرکزیت پیدا ہو گئی، لیکن نئے نئے مسائل ہر روز سامنے آتے تھے، ان مسائل کا فیصلہ کرنے کیلئے دو قسم کے مکتب خیال پیدا ہو گئے بعض لوگ اس خیال کے پیرو تھے کہ جو فیصلے رسول اللہ نے کئے ہیں وہی فیصلے ہمیشہ کے لئے اٹل ہیں اور اب کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ اپنے قیاس (عقل و فکر) سے نئے احکام مستنبط کرے۔ یہ لوگ اہلحدیث کے نام سے متعارف ہوئے۔ رسول اللہ صلعم اپنے فیصلوں کا کوئی مستند مجموعہ امت کو دیکر نہیں گئے تھے (اسلئے کہ یہ منشائے رسالت تھا ہی نہیں کہ حضورؐ کے فیصلے جو لامحالہ اپنے زمانے کے احوال و ظروف کے مطابق دیئے گئے تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اٹل اور قطعی تصور کر لئے جائیں) لیکن مندرجہ بالا ضرورت کے ماتحت ان فیصلوں کو جمع کرنا شروع کر دیا گیا۔ ان مجموعوں کا نام کتب روایات ہے جنھیں لوگوں سے سن سنا کر جامعین حدیث نے جنھیں قابل قبول سمجھا انھیں رکھ لیا اور جنھیں ایسا نہ سمجھا انھیں مسترد کر دیا۔ ان روایات کے متعلق اہلحدیث نے یہ عقیدہ پیدا کیا کہ یہ قرآن کے ہم پایہ ہیں اور خدا کی طرف سے وحی شدہ، لہذا ان ہی کی اطاعت خدا اور رسول کی اطاعت ہے۔

دوسرا گروہ وہ تھا جس نے کہا کہ جو مسائل ہمارے سامنے آئیں گے ہم ان میں خود غور و فکر کریں گے اور اپنی رائے سے کسی فیصلہ پر پہنچیں گے ان لوگوں کو اہل الرائے کہا جاتا ہے ان اہل الرائے حضرات میں امام ابوحنیفہؒ بہت زیادہ مشہور ہیں۔ آپ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے ۱۵۰ھ ہجری میں وفات پا گئے۔ امام صاحب نے اپنی فقہ کو تنہا اپنی رائے سے مرتب نہیں فرمایا تھا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں میں سے چند نامور اشخاص منتخب کئے اور ان پر مشتمل ایک مجلس مرتب کی۔ ان میں قاضی ابو یوسف اور امام محمد خاص طور پر مشہور ہیں۔ (حنفیوں کے ہاں انھیں صاحبین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) اس طرح قریب تیس برس کی مدت میں فقہی احکام کا ایک مجموعہ مرتب کیا گیا لیکن وہ مجموعہ اب کہیں موجود نہیں (اور نہ ہی امام صاحبؒ کی کوئی اور تصنیف موجود ہے) امام صاحبؒ کے مسائل کا جو ذخیرہ آج دنیا میں موجود ہے وہ درحقیقت امام محمدؒ اور قاضی ابو یوسفؒ کی تالیفات ہیں۔ انھوں نے کئی مسائل میں خود امام صاحبؒ سے اختلاف بھی کیا ہے۔ قاضی ابو یوسفؒ خلفائے عباسیہ کے عہد میں قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھے اس طرح سے فقہ حنفی خود عباسی حکومت کا قانون قرار پا گئی اور رفتہ رفتہ دیگر ممالک میں بھی پھیل گئی۔ کچھ وقت تک تو یہ مشکل رہی کہ ایک فقیہ کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنے اجتہاد کی بنا پر اپنے پیشرو فقہاء کے فیصلوں سے اختلاف کرے لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال بدلتا گیا اور جب امت پر ہر طرف سے جمود اور تعطل طاری ہو گیا تو اس خیال کی جگہ اس عقیدہ نے لے لی کہ جو کچھ ائمہ سابقہ نے کر دیا ہے اس میں

ردوبدل کی گنجائش نہیں۔ اس طرح استنباط مسائل میں اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ اس مسلک کو تقلید کا مسلک کہتے ہیں یعنی کسی خاص فقہ کی بلا چون وچرا اور بلا غور وفکر پیروی کرنا[1]۔ ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کی اکثریت فقہ حنفی کے مقلدین کی ہے ان کے برعکس اہلحدیث کو غیر مقلد (یا وہابی) کہا جاتا ہے (حالانکہ یہ نسبت ہر اہلحدیث کی طرف درست نہیں ہے) قرآن اور حدیث کے متعلق حنفی حضرات کا عقیدہ کیا ہے؟ اس کے متعلق فقہ حنفی کے پیشوا اور مسلم امام ابوالحسن عبیداللہ الکرخیؒ کا قول ہے کہ

ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ یا تو مؤوّل ہے یا منسوخ ہے اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ مؤوّل یا منسوخ ہے۔ (بحوالہ تاریخ فقہ اسلامی ص۴۲۱)

یعنی دین میں سند فقہ حنفی کے ائمہ ہیں اور ہر وہ آیت یا حدیث جو ان کے فیصلوں کے خلاف جاتی ہو اس کی یا تو ایسی تاویل کی جائیگی جس سے وہ ان فیصلوں کے مطابق ہو جائے اور اگر وہ کسی تاویل سے بھی ان کے مطابق نہ بیٹھے تو اس کے متعلق سمجھ لینا چاہئے کہ وہ منسوخ ہے۔

فقہ حنفی کے متعلق مودودی صاحب کی رائے یہ ہے وہ فقہ جس کے متعلق مودودی صاحب کی تجویز یہ ہے کہ اسے مملکت پاکستان کا قانون بنا دیا جائے۔ اس فقہ میں حدیث کا جو مقام ہے اس پر امام کرخیؒ کا مذکورہ بالا قول واضح ہے یعنی ان کے نزدیک اتباع اپنے امام کے فیصلے کی ہے نہ کہ حدیث کی لیکن مودودی صاحب خود ہی یہ لکھ چکے ہیں کہ

جس شخص پر کسی مسئلہ میں سنت رسول روشن ہو جائے اس کے لئے پھر کسی دوسرے شخص کا قول لینا حرام ہے خواہ وہ کیسے ہی بڑے مرتبہ کا شخص ہو۔ (تفہیمات حصہ اول ص۳۲۵)

فقہ حنفی میں کتنے ایسے احکام ہیں جو صاف صاف حدیثوں کے خلاف ہیں اس کے متعلق تفصیل سے لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں مقلدوں اور غیر مقلدوں کے آئے دن کے مناظرے اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ خود مودودی صاحب فرماتے ہیں:

امام ابوحنیفہؒ کی فقہ میں آپ بکثرت ایسے مسائل دیکھیں گے جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ضعیف الاسناد کو قبول کر لیا گیا ہے یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔ (رسائل ومسائل ص۲۷۴-۲۷۵)

تقلید کے متعلق لکھتے ہیں:

میرے نزدیک ایک صاحب علم آدمی کیلئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ (رسائل ومسائل ص۲۴۴)

دوسرے مقام پر ہے:

اسلام میں دراصل تقلید سوائے رسول اللہؐ کے اور کسی کی نہیں اور رسول اللہؐ کی تقلید بھی اس بنا پر ہے کہ آپ جو کچھ فرماتے اور عمل کرتے ہیں وہ اللہ کے اذن اور فرمان کی بنا پر ہے ورنہ اصل میں تو مطاع اور آمر اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں۔ (رسائل ومسائل ص۲۳۶)

---

[1] تفاصیل کیلئے دیکھئے تاریخ الفقہ الاسلامی از خلامہ محمد الخضری اور سیرۃ النعمان مولفہ علامہ شبلی نعمانی۔

مجتہد کی صحیح پوزیشن کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ

یہیں سے نبی اور مجتہد کا فرق واضح ہوتا ہے۔ نبی کی بصیرت براہِ راست علمِ الٰہی سے مستفاد ہوتی ہے اسلئے اس کے احکام تمام ازمنہ و احوال کیلئے مناسب ہوتے ہیں مگر مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو زمان اور مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا نہ اسکی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات حصہ دوم ص۴۲۶)

دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

انسان بہرحال کمزوریوں کا مجموعہ ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کا مجتہد بھی غلطی کر سکتا ہے اور کر جاتا ہے۔ (تفہیمات حصہ اول ص۳۲۴)

وہ خود بعض مسائل میں فقہ حنفی سے اختلاف رکھتے ہیں چنانچہ رسائل و مسائل کے صفحہ ص۲۴۱ پر لکھتے ہیں۔

نماز جمعہ میں شرط مصر کے متعلق مجھے عام علمائے حنفیہ سے اختلاف ہے۔

انھوں نے بڑی شد و مد سے لکھا ہے کہ فقہیات کو اصل دین سمجھنے کی ذہنیت بڑی افسوسناک ذہنیت ہے چنانچہ وہ رسائل و مسائل کے ص۲۸۲ پر رقم طراز ہیں۔

مجھے افسوس ہے کہ فقہیات[1] کو اصل دین سمجھنے کی جس ذہنیت کے باعث مسلمان مدتوں آپس میں جھگڑے کرتے رہے ہیں اور جس کی وجہ سے ان کا متحد ہونا اور اصل دین کیلئے ملکر کام کرنا غیر ممکن ہو گیا ہے وہی ذہنیت بار بار بروئے کار آئے چلے جا رہی ہے۔

غور فرمائیے اب یہی مودودی صاحب یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ پاکستان کی اسلامی مملکت کا قانون فقہ حنفی ہونا چاہیئے۔ یعنی جس ذہنیت کا رونا آج تک رویا جا رہا تھا اسی ذہنیت کو اب پوری کی پوری قوم پر بطور ملکی قانون مسلط کرنے کے مشورے دیئے جا رہے ہیں۔ یہ وہی فقہ ہے جسے وہ "منجمد شاستر" کی اصطلاح سے تعبیر کر چکے ہیں چنانچہ وہ سیاسی کشمکش حصہ سوم میں لکھتے ہیں کہ اسلام کے حق میں جو چیز شدید تر رکاوٹ ہے وہ ہماری یہ جامد اور بے روح مذہبیت ہے جسے آج کل اسلام سمجھا جا رہا ہے اس مسخ شدہ مذہبیت میں بنیادی نقص یہ ہے کہ

اس میں اسلامی شریعت کو ایک "منجمد شاستر" بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کے بجائے محض عہد گذشتہ کی ایک تاریخی تحریک بن کر رہ گیا ہے۔ (ص۳۶)

یہ ہے وہ "منجمد شاستر" جس کے متعلق اب تجویز فرمایا جا رہا ہے کہ اسے ملک کا قانون بننا چاہیئے (تاکہ اکثریت ان کے ساتھ رہے)۔

ایسا پرانا قانون اب کیسے چل سکیگا

آپ نے دیکھ لیا کہ مودودی صاحب کے نزدیک وہ فقہ جس پر مسلمان اس وقت کاربند ہیں کس طرح ایک "منجمد شاستر" کی حیثیت رکھتا ہے اور اس فقہ کو دین سمجھنے والی ذہنیت کس طرح دین کی راہ میں شدید ترین رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ لیکن جب یہی اعتراض ان پر کیا جاتا ہے کہ اس قدر پرانے زمانے کے فقہی احکام آج کے حالات میں کس طرح کام دے سکتے ہیں تو وہ فوراً اپنا رخ بدلتے ہیں اور ایک رعد آسا کڑک کے ساتھ فرماتے ہیں کہ کون کہتا ہے کہ یہ قانون پرانا ہو چکا ہے، تفصیل انہی کی زبان سے سنئے اور ورطۂ حیرت میں ڈوب جائیے کہ جس فقہی قانون کے متعلق ابھی ابھی یہ کچھ کہا جا رہا تھا اس کے متعلق اب کیا ارشاد ہوتا ہے: فرماتے ہیں:

---

[1] فقہیات اصل دین نہیں ہیں۔ یہی بات اگر ہم کہدیتے ہیں تو منکر حدیث اور منکر فقہ کا لیبل ہم پر چسپاں کر دیا جاتا ہے مگر ان لوگوں کی زبان کوئی نہیں پکڑتا۔

جن حضرات کی طرف سے یہ اعتراض (کہ صدیوں کا پرانا قانون جدید زمانے کی ایک سوسائٹی اور اسٹیٹ کی ضروریات کیلئے کس طرح کافی ہو سکتا ہے) پیش کیا جاتا ہے مجھے شبہ ہے کہ وہ اسلامی قانون کے متعلق ابتدائی اور سرسری واقفیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ غالباً انھوں نے کہیں سے بس یہ اڑتی اڑتی خبر سن لی ہے کہ اس قانون کے بنیادی احکام اور اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بیان ہوئے تھے اس کے بعد یہ بات انھوں نے بطور خود فرض کر لی کہ اس وقت سے یہ قانون جوں کا توں اسی حالت میں رکھا ہوا ہے۔ اسی بنا پر انھیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر آج ایک جدید ریاست اسے اپنا ملکی قانون بنالے تو وہ اس کی وسیع ضروریات کیلئے کیسے کافی ہو سکے گا۔ ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ جو بنیادی احکام و اصول ساڑھے تیرہ سو برس پہلے دیئے گئے تھے ان پر اسی وقت ایک ریاست قائم ہو گئی اور روزمرہ پیش آنے والے معاملات میں تعبیر[1] و قیاس و استحسان و اجتہاد کے ذریعہ سے اس قانون کا ارتقا اول روز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ پھر اسلامی اقتدار وسیع ہو کر بحر الکاہل سے بحر اوقیانوس تک آدھی سے زیادہ مہذب دنیا پر پھیل چکا تھا اور جتنی ریاستیں بھی بعد کے بارہ سو سال میں مسلمانوں نے قائم کیں ان سب[2] کا پورا نظم و نسق اسی قانون پر چلتا رہا۔ پھر دور اور ہر ملک کے حالات و ضروریات کے مطابق اس قانون میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا تک اس ارتقاء کا سلسلہ ایک دن کیلئے بھی نہیں رکا ہے۔ خود آپ کے اس ملک میں بھی انیسویں صدی کے اوائل تک اسلام ہی کا دیوانی اور فوجداری قانون جاری رہا۔ اب زیادہ سے زیادہ صرف سو سال کا وقفہ ایسا رہ جاتا ہے جس کے متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں اسلامی قانون پر عمل درآمد بند رہا اور اس کا ارتقاء رکا رہا۔ لیکن اول تو یہ وقفہ کچھ اتنا زیادہ بڑا نہیں ہے کہ ہم تھوڑی سی محنت و کاوش سے اس کے نقصان کی تلافی نہ کر سکیں۔ دوسرے ہمارے پاس ہر صدی کے فقہی ترقیات کا پورا ریکارڈ موجود ہے جسے دیکھکر ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف پہلے کتنا کام کر چکے ہیں اور آگے ہمیں کیا کام کرنا ہے۔ (اسلامی قانون ص ۲۵-۲۶)

یعنی ابھی ابھی مودودی صاحب فرما رہے تھے کہ چوتھی صدی ہجری سے علماء نے اجتہاد کو حرام قرار دے رکھا ہے جس کی وجہ سے اسلامی قانون منجمد شاستر بن کر رہ گیا ہے لیکن اب فرماتے ہیں کہ بارہ سو سال سے مسلسل ہر دور اور ہر ملک کے حالات و ضروریات کے متعلق اس قانون میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے اور اس ارتقاء کا سلسلہ ایک دن کے لئے بھی نہیں رکا۔ ان دونوں باتوں میں سے بہرحال ایک ہی صحیح ہو سکتی ہے۔ دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اس بارہ سو سال کے عرصہ میں جتنی ریاستیں بھی مسلمانوں نے

---

[1] ملاحظہ فرمائیے اول روز ہی سے یعنی جناب رسالتمآب صلعم کے عہد باسعادت ہی سے اس قانون کا ارتقاء شروع ہو گیا تھا اور وہ ارتقاء وحی غیر متلو کے ذریعے سے نہیں بلکہ تعبیر، قیاس، استحسان واجتہاد کے ذریعے سے شروع ہوا تھا۔ اسی حقیقت کا اظہار جب ہم کرتے ہیں تو ہمیں منکر حدیث کہا جاتا ہے۔

[2] لہٰذا اس دور کی تمام لعنتیں، شلاً بادشاہت وملوکیت۔ جاگیرداریت وغیرہ بھی سب اسی قانون کی برکات ہوں گی جن کے ساتھ خلفائے بنو امیہ و بنو عباس و دیگر امراء کی عیاشیوں کی شرمناک داستانیں معیشتی اور معاشرتی ناہمواریاں باہمی خونریزیاں اور مظالم و مفاسد کی لرزہ خیز داستانیں بھی شامل کر لیجئے۔ اور پھر یہ بھی کہ امام حسینؓ، محمد ابن النفس الزکیہؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، مجدد سرہندیؒ وغیرہ اکابرین ملت نے اسی قانونی نظم و نسق کے خلاف بغاوت کرنے کے جرم میں قتل و قید کے مصائب برداشت کئے ہوں گے جو پورا کا پورا اسی قانون شریعت پر مشتمل تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ ۱۲

قائم کیں ان سب کا پورا نظم و نسق اسی قانون پر چلتا رہا۔ یعنی بنو امیہ، بنو عباس، آل عثمان، حتیٰ کہ ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تک پورا نظم و نسق اسلامی قانون ہی کے مطابق تھا۔ ہندوستان میں صرف ایک سو سال تک اس ارتقاء کا سلسلہ رکا رہا جسے نہایت آسانی سے پورا کیا جا سکتا ہے، یعنی ان کے ارشاد کے مطابق اسلامی قانون وہ تھا جو مغلوں کے آخری دور میں ہندوستان میں رائج تھا اور جو آج بلا انقطاع افغانستان، ایران، عراق، شام، مصر اور حجاز وغیرہ میں نافذ العمل ہے۔ یہی وہ اسلامی قانون ہے جسے مودودی صاحب پاکستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا حضرات کو تو چھوڑیئے۔ ہم پاکستان کے سنجیدہ طبقہ سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ان کے نزدیک بھی اسلام کا منشا و مقصود یہی کچھ تھا جو سو سال پہلے تک ہندوستان میں پورا ہوتا رہا ہے اور جو آج باقی اسلامی ممالک میں پورا ہو رہا ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ اسلام کا منشا اسی قسم کی صورت حالات پیدا کرنا تھا تو بسم اللہ پاکستان میں وہی قانون نافذ کر دیجئے اور اپنی حالت ویسی ہی بنا لیجئے جیسی غدر کے زمانے تک تھی یا جیسی آج افغانستان عرب عراق کی ہے اور اگر سمجھتے ہیں کہ یہ صورت حالات تو قطعاً ایسی نہیں جس پر (مسلمان تو ایک طرف) ایک عام انسان بھی فخر کر سکے گا تو پھر سوچئے کہ یہ جدید قسم کی ملاازم آپ کو کدھر لئے جا رہی ہے۔

حضرت عمرؓ کے بعد ہی اسلام کے تمام شعبوں پر جاہلیت چھا چکی تھی

مودودی صاحب نے فرمایا ہے کہ اس بارہ سو سال میں جتنی ریاستیں بھی مسلمانوں نے قائم کیں ان سب کا پورا نظم و نسق اسلامی قانون پر چلتا رہا۔ لیکن ذرا سنئے کہ اس سے پہلے وہ خود کیا ارشاد فرما چکے ہیں۔ وہ اپنے مضمون "تجدید و احیائے دین" میں اسلامی نظام حکومت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے اس کام کو تکمیل تک پہنچا دیا اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اس کام کو اسی جامعیت کے ساتھ جاری رکھا۔

> پھر زمام قیادت حضرت عثمانؓ کی طرف منتقل ہوئی اور ابتداءً چند سال تک وہ نقشہ بدستور جاری رہا جو نبی علیہ الصلوٰۃ نے قائم کیا تھا مگر ایک طرف حکومت اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمانؓ جن پر اس کار عظیم کا بار رکھا گیا تھا ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیشروؤں کو عطا ہوئی تھیں اسلئے جاہلیت کو اسلامی نظام اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمانؓ نے اپنا سر دیکر اس خطرہ کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رکا۔ ان کے بعد حضرت علیؓ آگے بڑھے اور انہوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر ان کی جان کی قربانی بھی اس انقلاب معکوس کو نہ روک سکی۔ آخر کار خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ختم ہو گیا اور ملک عضوض (TYRANT-KINGDOM) نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہوگئی۔ (ترجمان القرآن ص ۲۴-۲۵ دسمبر ۱۹۴۰ء وجنوری ۱۹۴۱ء)

یعنی مودودی صاحب یہ فرما رہے تھے کہ اس بارہ سو سال کے عرصہ میں مسلمانوں نے جہاں جہاں بھی اپنی ریاستیں قائم کیں اس کا پورا نظم و نسق اسلامی نظام پر چلتا رہا اور اب یہ فرما رہے ہیں کہ اول تو حضرت عثمانؓ کے زمانہ ہی میں لیکن کامل طور پر حضرت علیؓ کے بعد حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہوگئی۔ اب یہ سنئے کہ حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد اس جاہلیت نے اسلام کے ساتھ کیا کیا فرماتے ہیں:-

حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد جاہلیت نے مرضِ سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے، کیونکہ اقتدار کی کنجی اب اسلام کے بجائے اس کے ہاتھ میں تھی اور اسلام زورِ حکومت سے محروم ہونے کے بعد اس کے نفوذ و اثر کو بڑھنے سے نہ روک سکتا تھا سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریئے یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شاید مقابلہ آسان ہوتا۔ مگر وہاں تو آگے آگے توحید کا اقرار، رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی۔ ایک ہی وجود میں اسلام اور جاہلیت کا اجتماع ایسی سخت پیچیدگی پیدا کر دیتا ہے کہ اس سے عہدہ برا ہونا ہمیشہ جاہلیتِ صریحہ کے مقابلہ کی نسبت ہزاروں گنا زیادہ مشکل ثابت ہوا ہے۔ عریاں جاہلیت سے لڑیئے تو لاکھوں مجاہدین سر ہتھیلیوں پر لئے آپ کے ساتھ ہو جائیں گے اور کوئی مسلمان علانیہ اس کی حمایت نہ کر سکے گا۔ مگر اس مرکب جاہلیت سے لڑنے جایئے تو منافقین ہی نہیں، بہت سے اصلی مسلمان بھی اس کی حمایت پر کمربستہ ہو جائیں گے اور الٹا آپ کو موردِ الزام بنا ڈالیں گے۔ جاہلی امارت کی مسند اور جاہلی سیاست کی رہنمائی پر "مسلمان" کا جلوہ افروز ہونا، جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلم ہونا، جاہلیت کے سجادہ پر "مسلمان" کا مرشد بن کر بیٹھنا وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

اس معکوس انقلاب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی تھا کہ اسلام کا نقاب اوڑھ کر تینوں قسم کی جاہلیتوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کر دیں اور ان کے اثرات بدروز بروز زیادہ پھیلتے چلے گئے۔

یہ تین قسم کی جاہلیتیں مودودی صاحب کے نزدیک جاہلیت خالصہ، جاہلیت مشرکانہ اور جاہلیت راہبانہ تھیں۔ جاہلیتِ خالصہ نے اسلامی نظام کو کس طرح متاثر کیا اس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

جاہلیت خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جمایا۔ نام خلافت کا تھا اور اصل میں وہی بادشاہی تھی جس کو مٹانے کیلئے اسلام آیا تھا۔ بادشاہوں کو اللہ کہنے کی ہمت کسی میں باقی نہ تھی اسلئے السلطان ظل اللہ کا بہانہ اختیار کیا گیا اور اس بہانہ سے وہی مطاعِ مطلق کی حیثیت بادشاہوں نے اختیار کی جو اللہ کی ہوتی ہے۔ اس شاہی کی سرپرستی میں امراء، حکام، ولاۃ، اہل لشکر اور مترفین کی زندگیوں میں کم و بیش خالص جاہلیت کا نقطۂ نظر پھیل گیا اور اس نے ان کے اخلاق اور معاشرت کو پوری طرح ماؤف کر دیا۔ پھر یہ بالکل ایک طبعی امر تھا کہ اس کے ساتھ ہی جاہلیت کا فلسفہ، ادب اور ہنر بھی پھیلنا شروع ہوا اور علوم و فنون بھی اسی طرز پر مرتب و مدون ہوں، کیونکہ یہ سب چیزیں دولت اور حکومت کی سرپرستی چاہتی ہیں اور جہاں دولت اور حکومت جاہلیت کے قبضہ میں ہوں وہاں ان پر بھی جاہلیت کا تسلط ناگزیر ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ یونان اور عجم کے فلسفے اور علوم و آداب نے اس سوسائٹی میں راہ پائی جو اسلام کی طرف منسوب تھی اور اس کی دراندازی سے "کلامیات" کی بحثیں شروع ہوئیں، اعتزال مسلک نکلا، زندقہ اور الحاد پر پُرزے نکالنے لگا اور "عقائد" کی موشگافیوں نے نئے نئے فرقے پیدا کر دیئے۔

یعنی مودودی صاحب کی تحقیق کے مطابق جب حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد جاہلیت خالصہ مسلمانوں کے سیاسی اور اسلامی نظام پر مسلط ہوئی ہے تو رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ ان کی تمدنی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو اسلامی بنیادوں پر قائم رہ گیا ہو۔ انہوں نے

جاہلیت راہبانہ کے ساتھ مل کر سوسائٹی کے اچھے عناصر کو مارفیا کا انجکشن دیکر سست کر دیا، پادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا، اسلامی علوم و فنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا۔" (ایضاً ص۳۷) اس کے ساتھ جاہلیت مشرکانہ نے "پرانی عبادات کی رسموں کو بدل کر نئی رسمیں ایجاد کیں۔ اس کام میں دنیا پرست علماء نے ان کی بڑی مدد کی، اور وہ بہت سی مشکلات ان کے راستہ سے دور کر دیں جو شرک کو اسلام میں نصب کرنے میں پیش آسکتی تھیں"۔ (ایضاً ص۳۷) اس کے بعد انھوں نے یہ لکھا تھا کہ ایک مجدد کا کام یہ ہوگا کہ وہ احیائے نظام اسلامی کرے جس کے معنی ہیں:

"جاہلیت کے ہاتھ سے اقتدار کی کنجیاں چھین لینا اور از سر نو حکومت کو عملاً اس نظام پر قائم کر دینا جسے صاحب شریعت نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ (ایضاً ص۳۱)

یعنی رسول اللہؐ نے حکومت کو اسلامی نظام پر قائم کیا۔ یہ نظام اپنی اصلی شکل میں حضرت عمرؓ کے دور تک قائم رہا اس کے بعد اس میں جاہلیت نے راہ پانا شروع کر دی اور حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد اس پورے نظام کی جگہ نظام جاہلیت نے لیلی جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر گوشہ پر مسلط ہو گئی اور یہی نظام جاہلیت آج تک قائم ہے اور اب ایک مجدد کا کام یہ ہے کہ اس نظام جاہلیت کو الٹ کر از سر نو نظام حکومت کی بنیاد اسی منہاج پر رکھے کہ جس پر اسے رسول اللہؐ نے تشکیل فرمایا تھا۔ مودودی صاحب نے ان خیالات کا اظہار ۱۹۴۱ء میں فرمایا تھا لیکن آج وہی مودودی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ "اس بارہ سو سال کے عرصہ میں مسلمانوں نے جتنی ریاستیں بھی قائم کیں ان سب کا پورا نظم و نسق اسی قانون پر چلتا رہا جو ساڑھے تیرہ سو برس پہلے بیان ہوئے تھے" اور اب کرنے کا کام فقط اتنا ہے کہ اسی نظام کو (جو ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی وجہ سے منقطع ہو گیا تھا) پاکستان میں رائج کر دیا جائے۔ اس طرح پاکستان صحیح اسلامی مملکت بن جائے گا۔

یہ تضاد کیوں؟ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ ایک ہی شخص اسلام کی اصل و اساس کے متعلق اسقدر متضاد باتیں کس طرح کہہ سکتا ہے لیکن حالات پر نگاہ رکھنے والوں کے لئے اس کی وجہ معلوم کر لینا کچھ دشوار نہیں۔ ۱۹۴۱ء میں "حکومت کی مسندیں" مودودی صاحب کے تصور تک میں بھی نہیں آسکتی تھیں۔ اس وقت ان کے سامنے مسلم لیگ کے مقابلہ میں اپنی جماعت سازی اور اس کی قیادت کے مقابلہ میں اپنی امارت کا خیال تھا چنانچہ وہ اپنے مذکورہ صدر مضمون میں مجددین سابقہ کی ناکامیوں پر تبصرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ان سے ہمیں سبق یہ ملتا ہے کہ

تجدد دین کیلئے صرف علوم دینیہ کا احیاء اور اتباع شریعت کی روح کو تازہ کر دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ایک جامع اور ہمہ گیر اسلامی تحریک کی ضرورت ہے جو تمام علوم و افکار، تمام فنون و صناعات اور تمام شعبہ ہائے زندگی پر اپنا اثر پھیلا دے اور تمام امکانی قوتوں سے اسلام کی خدمت لے اور دوسرا سبق جو اسی سے قریب الماخذ ہے یہ ہے کہ اب تجدید کا کام نئی اجتہادی قوت کا طالب ہے۔ محض وہ اجتہادی بصیرت جو شاہ ولی اللہ صاحبؒ یا ان سے پہلے کے مجتہدین و مجددین کے کارناموں میں پائی جاتی ہے اسوقت کے کام سے عہدہ برآ ہونے کیلئے کافی نہیں ہے۔ (ایضاً ص۹۷-۹۸)

لیکن اب سوال حکومت کی کرسیوں کا آگیا اور ان کے حصول کا طریقہ اصول جمہوریت کے مطابق یہی ہے کہ اکثریت کو ساتھ رکھا جائے

اب مسلمانوں سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تمہارے آبا و اجداد بارہ سو برس سے نظام جاہلیت پر کاربند چلے آ رہے تھے اب ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ اس بارہ سو سال میں تمہارے آبا و اجداد نے جہاں جہاں بھی ریاستیں قائم کیں ان کا پورا نظم و نسق اسلامی قانون کے عین مطابق تھا اور وہی نظم و نسق میں رائج کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اس بارہ سو سال میں اسلام اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہا اور مسلمانوں کی سلطنتوں کا نظم و نسق اسلامی نظام کے مطابق نہیں تھا (اور نہ ہی آج ہے) یہ سب فتنہ پرداز ہیں خدا اور رسول کے منکر اور تمہارے اسلاف کی توہین کرتے ہیں۔

اصل حقیقت

اصل یہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کے عہد مبارک کے تھوڑے عرصہ بعد ہی اسلام اپنی اصلی پٹڑی سے اُتر گیا تھا اور اس کے بعد اس میں رفتہ رفتہ تمام غیر اسلامی عناصر داخل ہو گئے تھے۔ ہمارا تمام لٹریچر اسی دور کا پیدا شدہ ہے جس میں اسلام غیر اسلامی (عجمی) عناصر سے بدلا جا چکا تھا۔ ہماری تاریخ، ہماری احادیث، ہماری تفاسیر سب اسی دور کی تخلیق ہیں۔ یہی حالت ہمارے قانون (فقہ) کی بھی ہے۔ اس کی تو تدوین ہی خالص ملوکیت کے زمانہ میں ہوئی تھی اور پھر اس کے بعد آج اس کا بھی علم نہیں کہ جناب امام ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں نے کیا فیصلے کئے تھے اور آج جس چیز کا نام فقہ حنفی ہے وہ کون کون سے عناصر کا مجموعہ ہے۔ اندریں حالات ان میں سے کسی چیز کے متعلق بھی یہ فرض کر لینا کہ وہ بالکل اسلام کے مطابق ہے بنیادی غلطی ہے۔ اس تمام طومار میں صرف اللہ کی کتاب ایسی ہے جو اپنی اصلی شکل میں اس وقت تک قائم ہے اور چونکہ مطاع حقیقی صرف خدا ہے اسلئے ہمیں اس تمام ذخیرہ پر قرآن کی روشنی میں تنقیدی نگاہ ڈالنی چاہئے اور اس طرح کھرے کو کھوٹے سے الگ کر دینا چاہئے۔ کسی انسان کے قول یا اس کی طرف منسوب شدہ اقوال کو تنقید کی حد سے بالاقرار دیدینا قرآن کے بنیادی ذہن کے خلاف ہے۔ یہی وہ مسلک تھا جو خود امام اعظمؒ نے اختیار کیا۔ چنانچہ اور تو اور وہ تو صحابہؓ کے متعلق بھی یہ کہتے ہیں کہ میں ان کے اقوال میں سے جس کو چاہتا ہوں لیتا ہوں اور جس کو چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں۔ باقی رہے دیگر مجتہدین تو ان کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ

> جب ابراہیم شعبی، حسن، ابن سیرین (اور بھی کئی مجتہدین کے نام لئے ہیں) تک معاملہ پہنچتا ہے تو مجھے یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ جس طرح ان لوگوں نے اجتہاد کیا ہے اسی طرح میں بھی کروں۔ (تاریخ فقہ اسلامی ص۳۲۲)

لہٰذا خود امام اعظمؒ کی "تقلید" بھی اسی میں ہے کہ جس طرح انھوں نے خود اجتہاد کیا تھا ہم بھی خود اجتہاد کریں۔ جس طرح ان کے دور میں نئے نئے حالات پیش آتے تھے اور ان کے لئے انھیں نئے نئے استنباطات کرنے پڑتے تھے اسی طرح ہمارے دور میں بھی نئے نئے حالات پیدا ہو رہے ہیں اور ہمیں بھی ان کے متعلق خود فیصلے کرنے چاہئیں لہٰذا صحیح اسلامی نظام یہ ہے کہ ہم (ہم سے مراد ہے ہر دور کے مسلمانوں کی ہیئت اجتماعیہ) قرآن کریم کو اپنے نظام کا محور قرار دیں اور اس کے اصولوں کی روشنی میں اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود جزئیات متعین کریں۔ ان جزئیات کے تعین میں ہم ان کوششوں کو بھی سامنے رکھیں گے جو اس سے پہلے اسی نہج و اسلوب پر ہوتی رہی ہیں ان میں جو چیزیں ایسی ہونگی جن میں کسی تغیر کی ضرورت نہیں انھیں علیٰ حالہ رہنے دیا جائے گا دوسروں میں مناسب تبدیلیاں کر دی جائیں گی اور نئے امور کے نئے فیصلے کئے جائیں گے۔ اور اس ساری کوشش کی اصل و بنیاد یہ ہوگی کہ کوئی شے قرآن کریم کے اصول سے نہ ہٹے۔ یہ ہے اسلامی نظام کی صحیح روح۔ یہی رسول اللہؐ نے کیا تھا اسی کے مطابق اس خلافت کے دور میں عمل رہا جو علیٰ منہاج النبوۃ قائم تھی اور اسی کے مطابق پھر سے اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے [illegible]

مُلّا کی قرآن فہمی

بعض لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ مُلّا کو قرآن سے اسقدر ضد کیوں ہے اس کی بہت سی وجوہات ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ قرآن مُلّا کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا اسلئے وہ جب بھی قرآن کے قریب جاتا ہے اسے اس میں اس قدر الجھاؤ، جھول، تناقض اور اشکال نظر آتے ہیں کہ وہ اسی میں عافیت سمجھتا ہے کہ خود بھی اسی پُرانی ڈگر پر چلا جائے اور لوگوں کو بھی اس پر چلنے کی تلقین کرتا رہے۔ یہ بات نہیں کہ قرآن کوئی ایسی مشکل کتاب ہے جس کے سمجھنے میں اسقدر دشواریاں لاحق ہوتی ہیں۔ قرآن تو خود روشنی ہے لیکن جس طرح سے روشنی سے وہی فائدہ اٹھا سکتا ہے جو اپنی آنکھیں کھلی رکھے اسی طرح قرآن کی روشنی سے بھی وہی شخص راہنمائی حاصل کر سکتا ہے جو قرآن کے سمجھنے میں عقل اور فکر سے کام لے۔ مُلّا کے نزدیک مذہب کو عقل سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس کا مسلک یہ ہے کہ جو ہوتا چلا آ رہا ہے اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہنا صحیح راہِ نجات ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ مُلّا اور عقل دو متضاد چیزیں بن کر رہ گئی ہیں اسلئے جب مُلّا اپنی آنکھوں پر تقلید کی پٹی باندھ کر قرآن کی طرف بڑھتا ہے تو اسے وہاں سے (قرآن کی مثال کی رو سے) اسی طرح آتشیں کوڑے پڑتے ہیں جس طرح آسمانی خبریں لانے کے مدعی کاہنوں کو پڑا کرتے تھے۔ اس سے پہلے مُلّا کو ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی کہ وہ قرآن کی طرف رُخ کرے لیکن چونکہ اس دور میں قرآن کا چرچا عام ہو رہا ہے اسلئے مُلّا کو بھی مجبوراً قرآن کے حوالے دینے پڑتے ہیں۔[1] لیکن اس معاملہ میں وہ کس قسم کی قلابازیاں کھاتا ہے اس کا کچھ اندازہ کرنا ہو تو آپ امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کا وہ مضمون پڑھئے جو ایک "نیا فتنہ" کے عنوان سے اپریل و مئی ۱۹۵۲ء کے ترجمان القرآن میں شائع ہوا ہے۔

یہ مضمون کسی مابعد الطبیعاتی موضوع سے متعلق نہیں جس میں مودودی صاحب کے فہم کو دشوار گذار گھاٹیوں سے گذرنا پڑتا۔ موضوع تھا "روزہ کے احکام" جو قرآن نے ایسے واضح اور سہل انداز میں بیان کئے ہیں کہ ان میں کسی الجھاؤ یا پریشانی کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا لیکن جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے جب انسان کی آنکھوں پر تقلید کی پٹی بندھی ہو تو قرآن کی روشنی اسے کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔

یہ مضمون کسی صاحب کے غلط استدلال کے جواب میں ہے اسلئے مودودی صاحب نے تمہیداً یہ لکھا ہے: "روزوں کے بارہ میں قرآن سے جو غلط استدلال انھوں نے کیا ہے اس کی غلطی واضح کرنے کے لئے سب سے پہلے ہم خود قرآن کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ زیر بحث آیات کا لفظی ترجمہ یہ ہے:

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، لکھ دیئے گئے تم پر روزے جس طرح لکھے گئے تھے تم سے پہلے کے لوگوں پر تاکہ تم پرہیزگاری کرو۔ روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا۔ پھر جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہیے شمار دوسرے دنوں سے۔ اور جو لوگ اس کی (یعنی روزے کی) طاقت رکھتے ہوں

---

[1] طلوع اسلام کی یہ کامیابی بھی کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ ۱۲

اُن پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا۔ پھر جو کوئی رضا کارانہ بجالائے نیکی تو وہ بہتر ہے اُسی کے لئے۔ اور یہ کہ تم روزہ رکھو، یہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم علم رکھتے ہو۔ ماہ رمضان وہ ہے جس میں نازل کیا گیا قرآن، رہنما بنا کر انسانوں کیلئے اور روشن آیات لئے ہوئے ہدایت اور تفریق حق و باطل کی۔ پس جو پائے تم میں سے اس مہینے کو تو چاہئے کہ اس کے روزے رکھے۔ اور جو مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہئے شمار دوسرے دنوں سے۔

آیات قرآنی کا مندرجہ صدر ترجمہ دینے کے بعد مودودی صاحب جو تنقید فرماتے ہیں وہ غور سے دیکھنے کے قابل ہے اس لئے ہم اقتباسات کے بجائے ان کی پوری کی پوری عبارت نقل کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

اس عبارت کو جو خالی الذہن ہو کر پڑھے گا اس کے دل میں لازماً پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ اگر یہ پوری عبارت ایک ہی سلسلۂ تقریر کی ہے جو بیک وقت ارشاد ہوئی تھی تو اس میں پہلے ہی یہ کیوں نہ کہہ دیا گیا کہ ماہ رمضان میں تم کو یہ نعمت دی گئی تھی اس لئے تم میں سے جو اُس کو پائے اسے چاہئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے؟ آخر یہ کیا اندازِ بیان ہے کہ پہلے کہا "روزہ رکھنا چند گنے چُنے دنوں کا" پھر تین چار فقروں میں روزوں کے متعلق بعض احکام بیان کئے، پھر بتایا کہ وہ گنے چُنے دن رمضان کے ہیں اور رمضان کو اس کام کیلئے اس وجہ سے منتخب کیا گیا ہے اور اس پورے مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ اس مربوط سلسلۂ تقریر میں شاید ایک اناڑی بھی اپنی بات یوں ادا نہ کرتا بلکہ یوں کہتا کہ اگلی قوموں کی طرح تم پر بھی روزے فرض کئے گئے ہیں اور چونکہ رمضان کے مہینے میں تم کو قرآن کی نعمت دی گئی ہے اسلئے یہ فرض روزے تم اس مہینے میں رکھو۔ اس کے بعد اس کو جو کچھ احکام بیان کرنے ہوتے وہ بیان کر دیتا۔

دوسرا سوال ایک خالی الذہن ناظر کے دل میں یہ پیدا ہوگا کہ اس سلسلۂ عبارت میں جب پہلے یہ فقرہ آچکا تھا کہ "جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو پورا ہونا چاہئے شمار دوسرے دنوں سے" تو اسی فقرے کو بعد میں پھر دُہرانے کی کیا حاجت تھی؟ اور اگر فی الواقع اُس کا دُہرانا ضروری تھا تو پھر یہ فقرہ بھی کیوں نہ دُہرایا گیا کہ "جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہوں ان پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا"؟ حقیقت میں ضرورت تو دونوں میں سے ایک کو بھی دہرانے کی نہ تھی۔ لیکن ایک کو دہرانا اور دوسرے کو نہ دہرانا تو ایک معما سا محسوس ہوتا ہے؟

تیسرا سوال جو اس کے دل میں کھٹکے گا وہ یہ ہے کہ "ماہِ رمضان وہ ہے" سے پہلے کی عبارت اور اس کے بعد کی عبارت کا مضمون ایک دوسرے سے صریحاً متناقض نظر آتا ہے۔ پہلا مضمون صاف طور پر یہ کہہ رہا ہے کہ جو شخص طاقت رکھنے کے باوجود روزہ نہ رکھے وہ فدیہ دیدے، لیکن اگر وہ روزہ ہی رکھے تو یہ اسی کے حق میں اچھا ہے۔ اس کے بالکل برعکس دوسرا مضمون یہ ظاہر کر رہا ہے کہ جو شخص ماہ رمضان کو پائے وہ اس میں ضرور روزہ رکھے اور اس لازمی حکم کو یہ بات مزید تقویت پہنچا رہی ہے کہ اس حکم کے بعد اس رعایت کا تو پھر اعادہ کر دیا گیا ہے جو پہلے مضمون میں مریض اور مسافر کو دی گئی تھی مگر اس رعایت کو ساقط کر دیا گیا ہے جو اوپر روزے کی طاقت رکھنے والے کو دی گئی تھی۔ ایک معمولی عقل و خرد رکھنے والے قانون ساز سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ ایک ہی معاملہ میں وہ بیک وقت دو مختلف احکام دیگا۔ پھر بھلا یہ فعل اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان کیسے ہو سکتا ہے۔

پہلے دو سوالات تو صرف سوالات ہی ہیں لیکن یہ آخری سوال تو ایک سخت اعتراض ہے جو اس عبارت پر وارد ہوتا ہے، اور

میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص حدیث سے مدد لئے بغیر اسے کیسے رفع کر سکتا ہے۔ جو لوگ حدیث کی مدد کے بغیر قرآن کو سمجھنے کے مدعی ہیں، اور حدیث کو احکامِ دین کا ماخذ اور قرآن کی مستند شرح ماننے سے انکار کرتے ہیں ان سے پوچھئے کہ ان کے پاس ان سوالات اور اس اعتراض کا کیا جواب ہے؟

مندرجہ بالا تنقید میں جناب مودودی صاحب (اور تو اور) خود اللہ تعالیٰ کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ جس ترتیب سے اللہ نے یہ احکام دیئے ہیں (معاذ اللہ) "شاید ایک اناڑی بھی اپنی بات یوں ادا نہ کرتا"۔ اس کے علاوہ انھیں ان آیات میں صریحاً تناقض نظر آرہا ہے اور اس کے بعد وہ بہ کمالِ شانِ امارت فرماتے ہیں "ایک معمولی عقل و خرد رکھنے والے قانون ساز سے بھی یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ ایک ہی معاملہ میں وہ بیک وقت دو مختلف احکام دے"۔ آخر میں ان کی تنقید کی تان یہاں آکر ٹوٹی کہ ـــــ قرآن پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ صرف حدیث سے رفع ہو سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر مودودی صاحب کا ارشاد یہ ہے کہ قرآن جس شکل میں آج ہمارے پاس موجود ہے وہ اس قسم کا ہے کہ اگر اسے خارجی سہارے نہ دیئے جائیں تو وہ (معاذ اللہ) اناڑیوں کی سی باتیں کرتا ہے۔ متضاد اور متناقض احکام صادر کرتا ہے اور اس قسم کا قانون دیتا ہے جس کی توقع ایک معمولی عقل و خرد رکھنے والے انسان سے بھی نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے ان تمام عیوب و اسقام کو رفع کرنے کے لئے ہمیں اور گوشوں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے اور وہ گوشے ہیں روایات کے مجموعے[1]۔

قبل اس کے کہ ہم قرآن کی زیرِ نظر آیات کو (مودودی صاحب کے الفاظ میں نہیں بلکہ) خود قرآن کے الفاظ میں پیش کر کے یہ بتائیں کہ وہ احکام کس قدر صاف اور واضح ہیں ہم قارئین کی توجہ اس اہم حقیقت کی طرف مرکوز کرنا چاہتے ہیں کہ وہ دیکھیں کہ مودودی صاحب کے نزدیک خالص قرآن کی پوزیشن کیا ہے۔ کیا قرآن کے متعلق اسلام کے مدترین دشمن ـــــ مسیحی مشنریوں اور آریہ سماجی پنڈتوں ـــــ نے اس سے کچھ مختلف کہا ہے جو مودودی صاحب ارشاد فرما رہے ہیں؟

بہرحال مودودی صاحب نے فرمایا یہ ہے کہ قرآن کے اس تناقض و تعارض کا حل حدیث سے ملتا ہے وہ حل کیا ہے اس کے متعلق وہ ارشاد فرماتے ہیں:-

اب دیکھئے کہ حدیث کس طرح ہمیں قرآن مجید کے اس مقام کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ جن لوگوں کے سامنے قرآن کے یہ احکام نازل ہوئے تھے، ان کا بیان یہ ہے کہ اس عبارت کا ایک حصہ جو "اے لوگو" سے شروع ہو کر "اگر تم علم رکھتے ہو" پر ختم ہوتا ہے، ابتداءً نازل ہوا تھا، اور دوسرا حصہ اس کے ایک سال بعد نازل ہوا۔ پہلے سال روزے فرض کرتے وقت یہ رعایت رکھی گئی تھی کہ آدمی روزے کی طاقت رکھنے کے

---

[1] خدا بھلا کرے محدثین کا جنھوں نے روایات کے مجموعے جمع کر کے (معاذ اللہ) خدا کی بگڑی ہوئی بات کو بنا دیا اور اس کے ان تمام نقائص کو دور کرنے کا سامان فراہم کر دیا۔ ورنہ رسول اللہ نے تو لا تکتبوا عنی سوی القرآن (مجھ سے قرآن کے سوا اور کوئی بات قلمبند نہ کرو) کا ناعاقبت اندیشانہ حکم صادر فرما کر (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ) کتاب اللہ کا بیڑا ہی غرق کر دیا تھا۔ آپ مودودی صاحب کا شکریہ ادا کیجئے کہ انھوں نے ایک انوکھی تحقیق سے امتِ اسلامیہ کو نوازا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بمصداق "غلط گو را حافظہ نباشد" ترجمان القرآن کے اسی پرچہ میں صرف بارہ صفحے کے بعد ص۱۰۲ پر مودودی صاحب اس غلط تحقیق انیق کی یوں تردید فرماتے ہیں "کسی مفصل بحث کے بجائے آپ کی تشفی کیلئے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ قرآن مجید اپنے مدعا کو بغیر کسی ابہام کے صاف صاف بیان کرتا ہے اور اس نے کسی ایسی حقیقت کو جس کا جاننا آدمی کی ہدایت کیلئے ضروری تھا واضح کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے"۔ اب مودودی صاحب سے پوچھئے کہ ان دونوں میں سے کونسی بات صحیح ہے ص۹۸ والی بات یا ص۱۰۲ والی؟ سچ ہے وما قدروا اللہ حق قدرہ ۔

باوجود اگر روزہ نہ رکھے تو فدیہ دیدے مگر دوسرے سال اس رعایت کو منسوخ کر دیا گیا، البتہ مسافر اور مریض کے لئے سابق رعایت بحال رکھی گئی۔

اس بیان سے نہ صرف یہ کہ سارے اشکالات رفع ہو گئے بلکہ یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ دوسرے سال آخری اور قطعی حکم دیتے ہوئے یہ تمہید کیوں اٹھائی گئی کہ یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں تمہیں قرآن جیسی نعمت دی گئی ہے۔ اب بات سمجھ میں آ گئی کہ پہلے اللہ کی اس نعمت کا احساس دلایا گیا، پھر حکم دیا گیا کہ اس نعمت کے شکریے میں تم کو اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ حدیث کی رو سے ہمیں حل کیا ملا؟ حل یہ ملا کہ:

(۱) پہلے سال روزے فرض کرتے وقت یہ رعایت رکھی گئی تھی کہ آدمی روزے کی طاقت رکھنے کے باوجود اگر روزہ نہ رکھے تو فدیہ دیدے مگر

(۲) دوسرے سال اس رعایت کو منسوخ کر دیا گیا۔

ذرا آپ سوچئے کہ اس سے اس قانون ساز کے متعلق جسے ہم عالم الغیب کہتے ہیں کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ اس نے جب پہلے سال روزے فرض کئے تو یوں حکم دیا کہ تم پر روزے فرض ہیں لیکن جو تم میں سے روزہ رکھنے کی طاقت رکھیں وہ روزے کے بجائے فدیہ دیدیں یعنی بالفاظِ دیگر جو روزہ رکھ سکنے کی طاقت رکھیں وہ تو فدیہ دیں اور روزہ وہ رکھیں جنھیں روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو۔ حکم قرآنی کی اس تشریح کو جو مودودی صاحب نے خیر سے حدیث کی مدد سے کی ہے کسی سلیم العقل انسان کے سامنے رکھئے اور پھر اس سے پوچھئے کہ قرآن کے متعلق وہ کیا اندازہ قائم کرتا ہے۔

اب آگے بڑھئے۔ فرماتے ہیں کہ دوسرے ہی سال اللہ تعالیٰ نے اس رعایت کو منسوخ کر دیا یعنی ایک ہی سال کے تجربہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے محسوس کر لیا کہ میں نے کس قسم کا حکم دیدیا تھا۔ وہ معاذ اللہ معاذ اللہ اپنی غلطی پر متنبہ ہوا اور اپنے پہلے حکم کو واپس لے لیا۔

لیکن مودودی صاحب اس عملِ تنسیخ کی "حکمت" بھی بیان فرماتے ہیں۔ وہ محدثین و مفسرین کی تشریح کے مطابق لکھتے ہیں کہ "نماز اور روزہ دونوں کی موجودہ صورت بتدریج قائم کی گئی ہے۔ . . . . . جب نبی صلعم مدینہ تشریف لائے تو آپ ہر مہینے تین دن کے روزے رکھتے تھے اور ایک روزہ محرم کی دسویں کو رکھا کرتے تھے پھر اللہ نے رمضان کے روزے فرض کئے مگر یہ رعایت رکھی کہ جو روزہ نہ رکھے وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے اس کے بعد حکم آیا کہ رمضان کے روزے ضرور رکھے جائیں اور تندرست مقیم آدمی کیلئے فدیہ کی رعایت منسوخ کر دی گئی[1]"

مودودی صاحب نے فرمایا یہ ہے کہ اس عملِ تنسیخ کی حکمت یہ تھی کہ روزہ کے احکام بہ تدریج نازل ہوئے تھے یعنی پہلے کچھ رعایتیں دی گئیں اور جب لوگ آہستہ آہستہ اس کے عادی ہو گئے تو پھر وہ رعایتیں منسوخ کر دیں۔ روزے ۲ھ میں فرض ہوئے تھے جب تمام رعایتیں

---

[1] مودودی صاحب کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ فدیہ کی رعایت تندرست اور مقیم کے لئے منسوخ ہوئی۔ مریض اور مسافر کیلئے باقی رہی۔ کیا ہم ان سے اتنا پوچھ سکتے ہیں کہ قرآن میں مریض اور مسافر کیلئے فدیہ کی رعایت کہاں ہے؟ قرآن ان کے لئے دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر دینے کا حکم دیتا ہے۔ فدیہ کی رعایت کہیں نہیں دیتا۔ ۱۲

مسلمانوں کی تعداد تین چار سو سے زیادہ نہیں تھی۔ ان مسلمانوں کے لئے اس رعایت کو ضروری سمجھا گیا اور وہ بھی صرف ایک ہی سال کے لئے لیکن اس کے بعد خود رسول اللہ کی زندگی میں لاکھوں کی تعداد میں لوگ اسلام لائے لیکن ان کے لئے تدریج کی حکمت ضروری نہ سمجھی گئی۔ ان میں سے ہر شخص کو وہ روزے رکھنے پڑے جن میں رعایت منسوخ ہو چکی تھی معلوم نہیں ان تین چار سو مسلمانوں کے لئے اس رعایت کی کیا ضرورت تھی اور بعد والوں کے لئے اسے کیوں نہ ضروری سمجھا گیا۔ اگر مقصود یہ تھا کہ لوگ آہستہ آہستہ روزوں کے عادی ہو جائیں تو ہر نو مسلم کے لئے اس رعایت کی ضرورت تھی اور اگر یہ لاکھوں مسلمان ایمان لانے کے بعد پہلے سال کے روزے بلا رعایت رکھ سکتے تھے تو سنہ ۲ھ والے مسلمان ایسا کیوں نہیں کر سکتے تھے؟

احکام خداوندی پر اعتراضات کے سلسلہ میں مودودی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس عبارت میں "پہلے ہی یہ کیوں نہ کہدیا گیا کہ ماہِ رمضان میں تم کو یہ نعمت دی گئی تھی اسلئے تم میں سے جو اس کو پائے اسے چاہئے کہ وہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ آخر یہ کیا انداز بیان ہے کہ پہلے کہا کہ روزہ رکھنا چند گنے چنے دنوں کا۔ پھر تین چار فقروں میں روزوں کے متعلق بعض احکام بیان کئے پھر بتایا کہ وہ گنے چنے دن رمضان کے ہیں" اسی انداز بیان کو مودودی صاحب نے "اناڑی پن" سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس اشکال کا جو حل حدیث نے دیا ہے اس سے مودودی صاحب کے الفاظ میں "یہ بات بھی سمجھ میں آگئی کہ دوسرے سال آخری اور قطعی حکم دیتے ہوئے یہ تمہید کیوں اٹھائی گئی کہ یہ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں تمہیں قرآن جیسی نعمت دی گئی" مودودی صاحب کی اس تشریح سے بات یہ بنی کہ

(۱) پہلے سال روزوں کا حکم دیتے ہوئے رمضان کے مہینہ کا ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن

(۲) دوسرے سال کے احکام میں رمضان کا ذکر کیا گیا اور یہ ذکر اس لئے کیا گیا کہ رمضان میں قرآن نازل ہوا تھا۔

اس سے ظاہر ہے کہ یا تو پہلے سال کے روزے رمضان کے مہینے میں فرض نہیں ہوئے تھے اور رمضان کی تخصیص دوسرے سال کی گئی اور اگر پہلے سال بھی روزے رمضان میں تھے تو اس وقت ابھی قرآن نازل نہیں ہوا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں ہی غلط ہیں۔ خود مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ پہلے سال بھی رمضان ہی میں روزے فرض ہوئے تھے اور اس سے بھی غالباً انھیں انکار نہیں ہوگا کہ جس رمضان (سنہ ۲ ہجری) میں روزے فرض ہوئے ہیں قرآن اس سے پہلے نازل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلے ہی سال کے حکم میں تمہید اس سے کیوں نہ اٹھائی گئی کہ روزے رمضان کے مہینے کے فرض ہیں اور رمضان کے مہینے کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہے کہ اس میں قرآن نازل ہوا۔

سب سے بڑا اعتراض جو مودودی صاحب کے ذہن میں گھوم رہا ہے کہ قرآن نے پہلی آیات میں مسافر مریض اور طاقت رکھنے والے سے متعلق رعایات کو بیان کیا ہے لیکن اگلی آیات میں مریض اور مسافر کی رعایات کو تو دہرایا گیا ہے لیکن طاقت رکھنے والے کی رعایت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ لہذا یہ تناقض احکام ہیں اور ان میں تطبیق کی صورت یہی ہے کہ طاقت رکھنے والے کی رعایت کو منسوخ تصور کیا جائے۔

بالفاظ دیگر مودودی صاحب اصول یہ متعین فرماتے ہیں کہ اگر ایک مقام پر قرآن نے کسی معاملہ کی پانچ جزئیات کا ذکر کیا ہے اور دوسری جگہ تین جزئیات کا تو اس سے سمجھنا یہ چاہئے کہ باقی ماندہ دو جزئیات منسوخ ہو چکی ہیں۔ مثلاً دین کی بنیاد ایمان پر ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر اس کی تصریح فرمادی ہے کہ ایمان کے اجزاء پانچ ہیں یعنی اللہ[1]، ملائکہ[2]۔ کتب[3]۔ رسل[4] اور یوم آخرت[5] (مثلاً ۲/۱۷۷) پر ایمان لانا ——— لیکن دوسرے مقامات پر کہیں صرف اللہ اور رسول پر ایمان کا ذکر ہے۔ (۴/۱۵۲) کہیں صرف اللہ اور آخرت پر ایمان کا (۵/۶۹) اور کہیں فقط اللہ پر ایمان کا (۶۴/۸) مودودی صاحب کے مندرجہ بالا اصول کے مطابق ایمان کے وہ اجزاء جن کا ذکر قرآن کی دیگر آیات میں نہیں سب منسوخ ہیں۔ ایمان کے بعد دین کا بنیادی مسئلہ حرام اور حلال ہے۔ اس کے متعلق سورۂ مائدہ کی تیسری آیت میں جن چیزوں کو حرام کہا گیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے (۱) اَلْمَیْتَۃُ (مردار)۔ (۲) وَالدَّمُ (خون)۔ (۳) وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ (خنزیر کا گوشت)۔ (۴) وَمَآ اُھِلَّ لِغَیْرِ اللّٰہِ (جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے۔ (۵) وَالْمُنْخَنِقَۃُ (گلا گھونٹ کر مارا ہوا) ۔۔۔ (۶) وَالْمَوْقُوْذَۃُ (چوٹ لگ کر مرا ہوا)۔ (۷) وَالْمُتَرَدِّیَۃُ (اوپر سے گر کر مرا ہوا) (۸) وَالنَّطِیْحَۃُ (سینگ لگ کر مرا ہوا)۔ (۹) وَمَآ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ (جسے درندوں نے کھا لیا ہو بجز ان کے جنہیں تم نے ذبح کر لیا ہو)۔ (۱۰) وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ (اور جسے بتوں کے تھانوں پر ذبح کیا گیا ہو) (۱۱) وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ (اور جسے تم پانسوں سے تقسیم کرو)۔ لیکن سورۂ انعام اور سورۂ بقرہ دونوں میں صرف چار چیزوں کا ذکر ہے یعنی مردار[1]، بہتا ہوا خون۔ خنزیر کا گوشت[2] اور غیر اللہ کے ناموں کی طرف منسوب[3] (۶/۱۴۵ و ۲/۱۷۳) علاوہ ازیں سورۂ مائدہ اور سورۂ بقرہ میں صرف دم (خون) کا لفظ آیا ہے لیکن سورۂ انعام میں دم مسفوح (بہتا ہوا خون) بیان ہوا ہے۔ نیز سورۂ انعام اور سورۂ بقرہ میں حرام چیزوں کے بیان کے بعد یہ بھی ارشاد ہے فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فلا اثم علیہ (یعنی جو شخص مجبور ہو جائے اور اپنی خواہش اور خلاف ورزی قانون کی نیت سے ایسا نہ کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں) لیکن سورۂ مائدہ میں اس رعایت کا کوئی ذکر نہیں۔ مودودی صاحب کے اصول کے مطابق یہ رعایت تو ضرور منسوخ سمجھی جانی چاہئے کیونکہ اس کا ذکر سورۂ مائدہ میں نہیں آیا۔ نیز خون کے ساتھ مسفوح کی شرط بھی منسوخ سمجھی جانی چاہئے کیونکہ سورۂ بقرہ اور سورۂ مائدہ میں خالی خون کا ذکر ہے۔

قرآن سے اسی قسم کی اور بھی بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ان لوگوں کو اس کا بھی پتہ نہیں کہ قرآن کا انداز بیان کیا ہے۔ اس کا انداز یہ ہے کہ وہ کہیں ایک ہی چیز کا ذکر اجمالاً کرتا ہے کہیں اس کی تفصیل دیتا ہے کہیں اس تفصیل کے کوئی اجزاء بیان کرتا ہے کہیں کوئی اور اجزاء۔ اور اس طرح "تصریف آیات" (آیات کو بار بار لانے) سے مکمل حکم سامنے لے آتا ہے۔ احکام تو ایک طرف انبیاء سابقہ کے تذکار جلیلہ اور امم سابقہ کے قصص کے بارہ میں بھی اس کا یہی انداز ہے۔ مودودی صاحب اور ان جیسے حضرات چاہتے یہ ہیں کہ قرآن کا اسلوب اس قسم کا ہونا چاہئے تھا جس قسم کا اسلوب انہیں پسند ہے۔ اگر قرآن کا اسلوب بیان ویسا نہیں ہے تو یہ اناڑی پن کی دلیل ہے کیونکہ اس سے تضاد لازم آتا ہے۔ اس اناڑی پن کو دور کرنے کے لئے روایات کی تلاش ہوتی ہے اور تضادات کو رفع کرنے کیلئے آیات کو منسوخ بتایا جاتا ہے اور کبھی نہیں سوچتے کہ ہم یہ باتیں کس کے متعلق کہہ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ما قدروا اللہ حق قدرہ انہیں خدا کے متعلق صحیح اندازہ ہی نہیں۔

مودودی صاحب کو یہ بھی اعتراض ہے کہ چند ملحقہ آیات میں ایک ہی چیز کو دہرایا کیوں ہے۔ روزہ کے احکام دوسرے پارہ میں ہیں۔ اسی پارہ کے شروع میں تحویلِ قبلہ سے متعلق آیات ہیں جن میں کہا یہ گیا ہے کہ تم اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیرو۔ ان آیات میں دیکھئے کہ اس حکم کو کہ "تم اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیرو" کتنی بار اور کتنی متصل آیات میں دہرایا گیا ہے۔ پہلی آیت ۱۴۴ میں فرمایا:

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَام وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شَطْرَهٗ ۔

اس کے بعد آیت ۱۴۹ میں فرمایا:

ومن حيث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام

اور اس کے بعد انہی الفاظ کو اس سے اگلی آیت یعنی ۱۵۰ میں پھر دہرایا کہ

ومن حيث خرجت فول وجهك شطر المسجد الحرام

اور اس کے ساتھ ہی فرمایا:

وحيث ما كنتم فولوا وجوهكم شطره ۔

اگر (مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق) ایک حکم کو مسلسل آیات میں دہرانا اناڑی پن ہے تو معلوم نہیں وہ مندرجہ بالا آیات کے متعلق کیا ارشاد فرمائیں گے؟

مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق ان تمام اعتراضات و اشکالات کا حل (جو ان کے ارشاد کے مطابق قرآن پر وارد ہوتے ہیں) یہ ہے کہ طاقت رکھنے والے کی رعایت سے متعلق حکم کو منسوخ مانا جائے۔ یعنی انھوں نے تسلیم کیا ہے کہ قرآن کریم میں ایسے احکام بھی ہیں جو صرف پڑھنے کے لئے رکھے گئے ہیں (تاکہ ان سے تلاوت کا ثواب حاصل ہو) لیکن ان کا حکم منسوخ ہے۔ کیا وہ بتائیں گے کہ ناسخ اور منسوخ کے اس عقیدہ کی قرآنی سند کونسی ہے؟ اگر وہ یہ کہیں کہ اس کی سند سورۃ البقرہ کی یہ آیت ہے:

ما ننسخ من آية او ننسها نات بخير منها ۔ الآیہ۔ (۲/۱۰۶)

تو یہ جواب خود ان کی اپنی اس تفسیر کے خلاف جاتا ہے جو وہ تفہیم القرآن میں لکھ چکے ہیں۔ اس کے متعلق انھوں نے صاف صاف لکھا ہے کہ

> یہ ایک خاص شبہ کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی خدا کی طرف سے آئی تھیں اور یہ قرآن بھی خدا کی طرف سے ہے تو ان کے بعض احکام کی جگہ اس میں دوسرے احکام کیوں دیئے گئے ہیں ایک ہی خدا کی طرف سے مختلف وقتوں میں مختلف احکام کیسے ہو سکتے ہیں۔ (تفہیم القرآن صفحہ ۱۰۱ جلد ۱)

یعنی مودودی صاحب کی اس تفسیر کی رو سے (اور قرآن کا یہی صحیح مفہوم بھی ہے کہ) قرآن کریم نے کتب سابقہ کے بعض احکام کو منسوخ کیا ہے اور اسی امر کا تذکرہ یہاں کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کی آیات ناسخ ہیں اور کتب سابقہ کے متعلقہ احکام منسوخ۔ یہ نہیں کہ قرآن ہی کے اندر بعض آیات منسوخ ہیں اور بعض آیات ناسخ۔ قرآن کے متعلق یہ عقیدہ خدا اور اس کے کلام پر ایمانِ محکم کی ساری عمارت کو مسمار

کر دیتا ہے اور دراصل اسی مقصد کے لئے اسے عجمی سازشوں نے وضع کیا تھا۔ بہرحال جب خود مودودی صاحب کو اقرار ہے کہ قرآن کی مذکورہ صدر آیت (بابت ناسخ و منسوخ) کتب سابقہ کے منسوخ احکام سے متعلق ہے نہ کہ خود قرآن کے احکام سے۔ تو وہ براہِ کرم بتائیں کہ اس عقیدہ کی قرآنی سند کیا ہے کہ روزوں کے احکام سے متعلق ایک آیت دوسرے سال منسوخ کر دی گئی؟

مودودی صاحب نے جو اللہ میاں کو اناڑی، عقل و خرد سے بے بہرہ، متضاد اور متناقض احکام کا صادر کرنے والا، بے ربط اور بے ترتیب آیات نازل کرنے والا قرار دیا ہے اس کی بنیاد صرف اس قدر ہے کہ وہ عربی کے ایک لفظ (یطیقونہ) کا صحیح مطلب سمجھ نہیں سکے۔ اور اپنی اس جہالت کی بنا پر خدا اور قرآن کو وہ کچھ قرار دیدیا ہے جس کی جرأت کوئی زویمر یا دیانند ہی کر سکتا تھا۔ اگر انھیں اتنی سی عربی آتی کہ وہ اس لفظ کا صحیح مفہوم سمجھ لیتے تو انھیں خدا اور قرآن کے متعلق اس قدر گستاخیوں کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اور اس غلطی کی وجہ بھی وہی اندھی تقلید ہے کہ جو روایتوں اور تفسیروں میں لکھا ہوا پایا اُسے صحیفۂ خداوندی سے بڑھ کر مستند اور مقدس سمجھ لیا گیا۔ دیکھئے کہ بات کسقدر صاف ہے۔ روزے کے احکام یہ ہیں:

(۱) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝

(۱) اے مسلمانو! جس طرح ان لوگوں پر جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں روزہ فرض کیا گیا تھا اسی طرح تم پر بھی فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم تقویٰ شعار بن سکو۔

(۲) اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ

(۲) یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

(۳) فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ۔

(۳) پھر جو کوئی تم میں بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اس کیلئے اجازت ہے کہ دوسرے دنوں میں روزے رکھکر روزہ کے دنوں کی گنتی پوری کر دے۔

(۴) وَعَلَى الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَهٗ فِدْیَةٌ طَعَامُ مِسْكِیْنٍ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَهُوَ خَیْرٌ لَّهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

(۴) اور جو لوگ ایسے ہوں کہ وہ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں تو ان کیلئے روزہ کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔ پھر اگر کوئی اپنی خوشی سے کچھ زیادہ کرے تو یہ اس کیلئے مزید اجر کا موجب ہوگا لیکن اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

(۵) شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ .... فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ۔

(۵) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا پس جو کوئی تم میں سے اس مہینہ میں اپنے گھر پر موجود ہو تو وہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ اور جو کوئی تم میں سے مریض ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر دے۔

ان آیات سے ظاہر ہے،—

(۱) روزے رمضان کے مہینے کے ہیں۔

(۲) روزے اس کیلئے ہیں جو اس مہینے میں اپنے گھر میں موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض صحتیاب ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر روزوں کی گنتی پورے کردے۔

(۳) اب ایک مشکل اور باقی رہ جاتی ہے جو نہ مریض ہے (عام عرفی معنوں میں) اور نہ مسافر ہے مگر کسی وجہ سے اُسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی گھر پر موجود ہے اور مریض بھی نہیں لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ روزہ بمشکل رکھ سکتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ لے اسلئے کہ جتنے دن گذرتے جائیں گے بڑھاپا زیادہ غالب آتا جائیگا۔ اس کیلئے اس کے سوا کوئی دوسری صورت تھی ہی نہیں کہ اسے روزے معاف کرکے اس سے کچھ فدیہ لے لیا جائے۔ قرآن نے یہی حکم دیا ہے۔

غور کیجئے تو اوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہوگئے اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔ فرمائیے کہ اس میں کون سے اعتراضات تھے جن کے حل کرنے کیلئے مودودی صاحب کو قرآنی آیات کو منسوخ کرنے کی ضرورت پڑگئی۔

ہم نے "وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ" کا ترجمہ کیا ہے ——— "وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکیں"۔ اور مودودی صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے ——— "اور وہ لوگ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہوں" ——— سوال یہ ہے کہ "یطیقونہ" کا کونسا ترجمہ صحیح ہے۔ ہمارے ہاں اردو میں لفظ طاقت کا جو مفہوم ہے عربی میں اس کا وہ مفہوم نہیں۔ مودودی صاحب نے اردو کے مفہوم کو سامنے رکھکر آیت کا ترجمہ کردیا جس سے قرآن کا سارا مطلب ہی خبط ہوگیا۔ "طاقت" کا عربی مفہوم سمجھنے کے لئے عربی لغت کو دیکھئے۔ محیط المحیط (جلد دوم ص۱۳۱۲) میں ہے:

> طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا۔ لیکن یہ ایک ایسی مقدار کا نام ہے جسے انسان بہ مشقت کرسکے اور دراصل یہ اس طوق کے ساتھ تشبیہ ہے جو کسی چیز کو محیط ہو چنانچہ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔

اسی طرح عربی کے مشہور لغت لسان العرب (ج ۱۲ ص۱۰۳) میں ہے کہ

> طاقت، اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کیلئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار (ج ۲ ص۱۵۵) میں لکھتے ہیں۔

> اطاقۃ دراصل "مکنت" اور "قدرت" کے ادنیٰ درجہ کا نام ہے چنانچہ عرب لوگ اطاق الشئی صرف اس وقت کہتے ہیں جبکہ اس کی قدرت انتہائی ضعیف ہو یعنی دشواری کے ساتھ اس کو برداشت کرسکے چنانچہ یطیقونہ سے مراد بوڑھے ضعیف۔ اور اپاہج لوگ ہیں جنکی بیماریوں کے اچھا ہونے کی توقع نہ ہو اور وہ لوگ ہیں جو ان کے مثل ہوں مثلاً وہ کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی بنا پر امام راغب نے کہا ہے کہ طاقت اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا کسی انسان کیلئے بہ مشقت ممکن ہو۔

اسی کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے:

> طاقت کے معنی وہ کام ہیں جنھیں بہ تکلف یا بہ مشقت کیا جاسکے اور "وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ" سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں۔

ہیں جن کیلئے روزہ نہ رکھکر فدیہ دینے کا حکم ہے چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے منسوخ نہیں ہے۔ (تفسیر کشاف ص ۲۵۵ ج ۱)

تفسیر روح المعانی میں ہے کہ

عربی زبان میں "الوسع" کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور "طاقت" کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہٰذا (آیۂ زیر نظر کے) معنی یہ ہونگے کہ "اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ (روح المعانی ص ۵۹ ج ۲)

آپ نے دیکھ لیا کہ "طاقت" کا عربی زبان میں کیا مفہوم ہے اور مودودی صاحب اس کا کیا ترجمہ کرتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ مُلّا کی یہ پرانی عادت ہے کہ یہ اول خود ہی غلط مفروضہ قائم کرتا ہے اور پھر اس غلط مفروضہ پر غلطیوں کا ایک انبار جمع کرتا چلا جاتا ہے۔ یہی کچھ اس آیت کے مفہوم کی تحریف میں مودودی صاحب نے کیا ہے کہ اول تو خود ہی آیت کا غلط ترجمہ کیا اور پھر خود ہی اعتراضات کے طومار جمع کرتے چلے گئے جن کے سامنے نہ (معاذ اللہ) خدا کی کوئی حیثیت رہی نہ اس کی کتاب کی۔

جیسا کہ طلوع اسلام میں ہمیشہ لکھا جاتا ہے قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کر دیتا ہے اور اسے امت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ اس کی جزئیات خود متعین کرلے چنانچہ "علی الذین یطیقونہ" میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کر دیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں)۔ اس کی تفاصیل پہلے بھی متعین کی جا چکی ہیں اور ان پر اب بھی غور و خوض کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ القرطبی کی کتاب جامع احکام القرآن (ص ۲۶۸ و ۲۶۹ ج ۲) میں ہے کہ

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں ان کیلئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں۔ البتہ امام مالکؒ نے اتنا کہا ہے کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں تو یہ میرے نزدیک پسندیدہ ہے اور انسؓ۔ ابن عباسؓ۔ قیس ابن السائبؓ اور ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمے فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ اور اصحاب الرائے (حنفیہؒ) امام احمدؒ اور امام اسحٰقؒ کا قول بھی یہی ہے۔ نیز ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے اپنی اُمّ ولد سے فرمایا جو حاملہ تھی یا اپنے بچہ کو دودھ پلاتی تھی کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے۔ تیرے ذمہ فدیہ ہے۔ قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہٗ نے اس فہرست میں اور بھی اضافہ کیا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

"الذین یطیقونہ" سے یہاں مراد بوڑھے ضعیف لوگ ہیں اور وہ اپاہج لوگ ہیں جن کے امراض کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو اور ایسے ہی ان کے مثل جو لوگ ہوں مثلاً مزدور پیشہ لوگ جن کی معاش خدا نے ہمیشہ پر مشقت کاموں میں رکھدی ہے جیسے کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور ان ہی میں وہ مجرم بھی داخل ہیں جن کو قید خانوں میں مشکل کاموں کا حکم دیا جاتا ہو۔ اور ان پر روزہ رکھنا گراں ہو۔ . . . . .

تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جس کے دور ہونے کی امید نہ ہو، روزہ رکھنا گراں گذرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا

سبب بار بار مکرر ہوتا رہتا ہو جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کیلئے جائز ہے کہ وہ روزہ کی جگہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اتنا کھانا جو ایک درمیانی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار ج ۲ ص ۱۵۵ و ص ۱۵۶)

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔

(۱) بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت

(۲) حاملہ عورت

(۳) دودھ پلانے والی عورت

(۴) اپاہج

(۵) پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ ہو۔

(۶) ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی طور پر کمزوری پیدا ہوئے ہوں۔

(۷) وہ مزدوری پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پر مشقت کاموں میں ہو۔

(۸) وہ مجرم جنھیں جیل خانوں میں مشقت کے کام کرنا پڑتے ہوں۔

آپ غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کے معاملہ میں کسقدر رعایت رکھی تھی لیکن مُلّا نے اس رعایت کو منسوخ کر کے کسقدر دشواریاں پیدا کر دی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے تھے روزے رکھ کر ایسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو بعض اوقات ان کی جان تک لے لیتے ہیں اور اگر وہ روزہ چھوڑتے ہیں تو مُلّا ان کے پیچھے ڈنڈا لیکر اس بری طرح سے پھرتا ہے کہ ان پر زندگی اجیرن بن جاتی ہے۔ یہ ہے فرق خدا کی طرف سے عطا کردہ دین اور ملا کے خود ساختہ مذہب میں۔ دین تمام انسانی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر احکام صادر کرتا ہے اور مُلّا کا مذہب اندھے کی لاٹھی ہے۔

مُلا کی خود ساختہ سختیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ رفتہ رفتہ مذہب ہی سے برگشتہ ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہی وقت ہے کہ ان کے سامنے خدا کا دیا ہوا (قرآن کی اصولی تعلیم اور اس کی روشنی میں عقل انسانی کی رو سے طے کردہ جزئیات) پیش کیا جائے تا کہ وہ علی وجہ البصیرت دیکھ سکیں کہ دین کی بندشیں ایسی نہیں جن سے اس طرح بھاگا جائے۔

طلوعِ اسلام ڈیرہ غازیخاں میں

مسٹر اللہ بخش خاں صاحب نیوز ایجنٹ۔ نزد اڈا پنجاب ٹرانسپورٹ سروس

ڈیرہ غازی خان سے خریدیں۔

ایک عام اعتراض

(نوجوانوں کے دل کی دھڑکن)

اس خط کو ملاحظہ فرمائیے!

محترمی ایڈیٹر صاحب طلوع اسلام۔ کراچی۔ تسلیم! طلوع اسلام کافی عرصہ سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ کا طرز استدلال اور اجتہاد قابل داد ہے۔ اور آپ کی روشن دماغی مسلم۔ قرآن فہمی میں آپ کو جو ملکہ حاصل ہے وہ شاید ہی کسی کو ہو۔ مگر آپ کی یہ ذہانت اور استدلال اسلام کے راستہ کی مشکلات کو رفع نہیں کر سکتا۔ چونکہ جو واقعات صدیوں سے صفحۂ تاریخ پر ثبت ہیں وہ طلوع اسلام کے مٹانے سے مٹ نہیں سکتے۔ اور اگر آپ آج پونے چودہ سو سال کے بعد اُن واقعات کو نوچ نوچ کر اُن کے گھناؤنے پن کو دُور کرنا چاہیں تو میرا خیال ہے یہ ایک سعی لاحاصل ہوگی۔

آپ ہر بار اسلامی نظام کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام سے بہتر نظام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ کی طرح خوش عقیدہ اور لوگ نہیں ہو سکتے کیونکہ اسلامی تاریخ کا ایک ایک ورق بار بار یہ دُہرا رہا ہے کہ اسلامی نظام صرف ایک واہمہ ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ امرا اور حکمراں طبقہ کے ہاتھ میں ایک ایسا سحر ہے جس سے وہ جس وقت چاہیں عوام کو سُلا سکتے ہیں اور اُن کی آنکھوں سے اس کا اثر زائل ہونے ہی نہیں دیتے۔ اس کے سوا اگر کوئی اور اسلامی نظام ہے تو ممکن ہے کہ وہ آپ کے یا اور کسی کے ذہن میں موجود ہو تو ہو مگر نہ تو آج تک تاریخ نے اس نظام کی کبھی جھلک دیکھی اور نہ ہی آئندہ وہ دیکھ سکے گی۔ کیونکہ دوسرے نظاموں کی طرح یہ مفروضہ نظام کچھ عرصہ زندہ رہ کر ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔ اور خدا کی مشیت بھی یہی ہے کہ کوئی نظام پائیدار نہ ہو۔ کیونکہ انسان ارتقائی منازل طے کر رہا ہے اور اگر کوئی مستقل نظام اس پر مسلط کر دیا گیا تو اس کا ارتقا رک جائے گا۔ جو سراسر خلاف قانون قدرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی نظام خواہ وہ انسان کا بنایا ہوا ہو یا اُسے خدا کا بنایا ہوا کہا جائے وہ روئے زمین پر کہیں بھی متواتر رائج نہیں رہ سکتا۔ اس میں تغیر و تبدل زمانے کی ضروریات کے مطابق ہوتے رہتے ہیں۔

آپ کے مبینہ نظام اسلام نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے اس وقت جبکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رحلت فرمائے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا۔ حضورؐ کے صحابہ کرامؓ نے کیا کچھ کیا۔ خلیفہ اول کو کس نظام نے تلوار کی گھاٹ اتارا[1]۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کو کس نظام نے موت کی گھاٹ اتار دیا۔ حضرت عثمانؓ پر کیا بیتی۔ حضرت علیؓ کا حشر کیا ہوا۔ حضرت حسنؓ اور حسینؓ کس قربانگاہ پر بھینٹ چڑھے۔ اس کا حشر کیا ہوا۔ اور اس کے بعد آج تک کیا ہو رہا ہے۔ اسلامی تاریخ کا وہ کونسا صفحہ، صفحہ نہیں سطر، بلکہ وہ کونسا لفظ ہے

---

[1] خلیفہ اول کو کسی نے تلوار کی گھاٹ نہیں اتارا تھا۔ طلوع اسلام

جو بے گناہوں کے خون سے نہ لکھا گیا ہو۔ خیر اس پر تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام خلافت راشدہ تک ہی قائم رہا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے اسلام بری الذمہ ہے۔ مگر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کو کیوں قتل کیا گیا اور ان کے قاتل کو کیوں سزا نہ دی گئی اور حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص لینے والے امیر معاویہ نے نیزوں پر قرآن لٹکا کر کیوں علیؓ کی فوج کو لڑنے سے روک دیا اور کہا کہ تمام جھگڑوں کا فیصلہ قرآن کو درمیان میں رکھکر بذریعہ ثالثی کیا جائے اور پھر ثالثی فیصلہ کا کیا حشر ہوا۔ کیا اس جنگ میں دونوں اطراف سے صحابہؓ عشرہ مبشرہ موجود نہ تھے۔ وہ صحابہؓ موجود نہ تھے جنھوں نے رسول پاکؐ کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ کیا وہ اسلامی نظام سے واقف نہ تھے۔ پھر کیوں خونریزی ہوئی اور وہ بھی اس وقت جبکہ حضور پاکؐ کو رحلت فرمائے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا اور ان کے فیض سے براہ راست مستفیض ہونے والے صحابہ کرام اسلامی نظام کو ہم اور آپ سے بدرجہا بہتر سمجھتے تھے۔ وہ دوبارہ اسلامی نظام کو کیوں نہ زندہ کر سکے۔ کیا خدائی نظام ایسا ہی ہے کہ دنیا کی تاریخ میں صرف چند سال اپنی جھلک دکھا کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائے اور اس کے مقابلہ میں انسان کا بنایا ہوا نظام ہزارہا سال تک چلتا رہے۔ کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ اللہ میاں سے تو اس کے بندے ہی زیادہ سمجھدار ہیں کہ وہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جو اللہ میاں کے نظام کے مقابلے میں زیادہ مقبول ہوتا ہے اور زیادہ عرصہ چلتا ہے۔

محترم مدیر صاحب یاران سبکسار اں تو محمل تک جا پہنچے ہیں اور آپ اپنی قوم کے دامن کو پکڑ کر آج سے تیرہ سو سال پہلے کے دورِ وحشت کی طرف گھسیٹ رہے ہیں۔

آپ کس نظام کو ہم پر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ کیا آجتک اس کی کوئی باقاعدہ تشکیل ہوئی۔ آئینِ اسلامی کی کوئی کتاب چھپی یا ایسے آئین کا مجموعہ تیار کیا گیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے۔ کچھ بھی نہیں کیا گیا۔ آپ سے پوچھا جائے اسلامی آئین کیا چیز ہے۔ آپ قرآن کی ایک دو آیات پڑھ کر تفسیر کرنے لگیں گے۔ کسی حنفی سے پوچھا جائے وہ بخاری، مشکوٰۃ یا فقہ کی کتاب کا حوالہ دیدیگا شیعہ سے دریافت کیا جائے تو وہ مجتہدین کے اقوال کے حوالے دینے لگے گا۔ اور باقی فرقوں کے لوگوں سے پوچھنے پر بھی اسی قسم کا جواب ملیگا مگر آجتک نہ ہی کسی فرقہ کے علما نے آئین کی کتاب مرتب کی ہے اور نہ ہی اجتماعی طور پر تمام فرقوں کے علما نے کوئی آئین بنا کر پیش کیا ہے۔ آئین کے مطابق جو استدلال کیا جاتا ہے وہ کسی ایک شخص کی رائے تو ہو سکتا ہے مگر اسے قرآن، حدیث یا فقہ کا متن نہیں کہا جا سکتا۔

ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں کہ ہمارا آئین زمانہ کے مطابق ترقی یافتہ لائنوں پر وضع کیا جائے تاکہ ہم دنیا کی دیگر اقوام کے شانہ بشانہ مادی ترقی کر سکیں اور اس عالم اسلام پر جو ذلت اور نحوست چھائی ہوئی ہے اسے اس سے نجات دلا سکیں۔ اور اگر خدانخواستہ کسی قسم کا کوئی مبینہ اسلامی نظام قائم کر دیا گیا تو اس کا حشر معلوم۔ کیونکہ بنو امیہ اور بنو عباسیہ کی صدیوں کی کشمکش کی تاریخ شاہد ہے۔ اور یہاں بھی وہی تاریخ دہرائی جائے گی۔ یہ مرزائی ہے۔ اسے وزارتِ خارجہ سے الگ کر دو۔ اور مرزائیوں کو اقلیتی فرقہ قرار دو۔ یہ شیعہ ہے اسے وزارت یا سفارت سے نکال دو۔ کیونکہ یہ کافر ہے صحابہؓ پر سب وشتم کرتا ہے۔ یہ وہابی ہے، یہ فقہ کو نہیں مانتا اسے بھی نکال دو۔ اور یہ اہلِ قرآن ہے اسے بھی کراچی سے شہر بدر کر دو۔ کیونکہ یہ محدثین کی عرق ریزی سے جمع کی ہوئی احادیث کا منکر ہے

اسلئے کافر ہے۔ اور یہ . . . . . .

آپ کونسا اسلامی نظام قائم کریں گے۔ کیا آپ بقول شیعہ حضرات حق خلافت سادات کو تفویض فرمائیں گے۔ اگر نہیں تو شیعہ حضرات آپ سے کیسے تعاون کریں گے کیا آپ خلیفہ ثانی مرزا محمود احمد کو خلیفہ اول پاکستان تسلیم کریں گے۔ نہیں تو پھر مرزائی صاحبان کیوں ایسے نظام کو تسلیم کرینگے۔ اسی طرح دوسرا کونسا فرقہ ہوگا جو اسلامی آئین کی تشکیل میں آپ کا ساتھ دے

آپ میرا یہ طویل خط جس کیلئے میں معافی چاہتا ہوں۔ پڑھ کر مجھے گمراہ کہہ سکتے ہیں۔ کافر کہہ سکتے ہیں۔ کمیونسٹ یا اور جو کچھ آپ کے ذہن میں آئے کہہ سکتے ہیں۔ مگر خدارا حقائق کو نظر انداز نہ کریں۔ قوم کو تباہی اور بربادی کے غار میں نہ دھکیلیں۔ بار بار اسلامی آئین کی رٹ نہ لگائیں یہ ایک واہمہ ہے، خوش اعتقادی ہے، ہٹ دھرمی اور ضد ہے جس کو حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی آئین بھیجا ہوتا تو یقیناً وہ اس کے نفاذ کے لئے حالات پیدا کر دیتا اور اپنے ہمہ گیر آئین سے کبھی بھی اپنے بندوں کو محروم نہ کرتا۔ اس کا آئین یہی ہے جو چل رہا ہے اور زمانے کے ساتھ چلتا رہے گا۔ اس میں حالات کے مطابق ترامیم و تنسیخ بھی ہوں گی۔ یا ایک آئین کو ختم کر کے دوسرا بہتر آئین نافذ کر دیا جائے گا۔ یہی مشیت ربی اور سنت اللہ ہے جو ازل سے ابد تک چلی جائے گی۔

یہ عریضہ بے ربط سہی یا محض جذباتی ہی سہی مگر میں صرف اتنی استدعا کرتا ہوں کہ آپ صحابہ عشرہ مبشرہ نہیں بن سکتے۔ ابوبکرؓ عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ نہیں بن سکتے۔ اگر یہ بھی نہیں بن سکتے تو اسلامی آئین کیسے نافذ کریں گے جس نظام کو پہلے دو خلفا نے مضبوط کیا وہ عثمانؓ اور علیؓ کے دورِ خلافت میں کیوں روبہ انحطاط ہو گیا۔ آپ اس بارے میں غور فرمائیں کیا یہی مشیت ایسی نہیں تھی کہ وہ نظام ختم ہو کر ایک اور نظام جنم لے اور پھر ایک اور، اور، اور یہ سلسلہ چلتا رہے۔

میں پھر اس طویل خط کے لئے معافی چاہتا ہوں۔ اور آپ اسے مطالعہ کر کے جو بھی سخت سے سخت الفاظ میرے لئے استعمال کریں گے۔ انھیں میں خندہ پیشانی سے قبول کروں گا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میں نے آپ کے جذبات کو بہت بڑی ٹھیس پہنچائی ہے۔ اور اگر اس ٹھیس سے کوئی آواز پیدا ہو۔ تو مجھے یہ برداشت کرنا پڑے گی۔

اچھا۔ زیادہ آداب

اس خط کو ہم نے اس لئے شائع کیا ہے کہ یہ صرف مراسلہ نگار کے ذاتی خیالات کا آئینہ دار نہیں بلکہ ترجمانی کر رہا ہے ہماری موجودہ نسل کے نوجوانوں کے عام خیالات کی جو اسلام کے متعلق ان کے دل میں پیدا ہو کر ذہنی انتشار کا باعث، اور انھیں اسلام کی طرف سے متنفر کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ہمارے پاس اس قسم کے خطوط عام طور پر آتے رہتے ہیں ان کے علاوہ اکثر نوجوانوں کی طرف سے زبانی گفتگو میں بھی اسی قسم کے اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں۔ بنا بریں اسے زیادہ مناسب سمجھا گیا کہ اس کا جواب انفرادی نہیں بلکہ عمومی حیثیت سے بذریعہ طلوع اسلام دیا جائے۔ اس خط میں بہت سی تلخیاں اور بہت کچھ غلطیاں بھی ہیں لیکن ہم ان جزئیات سے صرف نظر کر کے صرف اصولی جواب پر اکتفا کریں گے۔

مراسلہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی نظام چند دنوں کے لئے قائم ہوا اس کے بعد ختم ہو گیا۔ اگر یہ نظام

مبنی برصداقت تھا اور اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی تو یہ ہمیشہ کے لئے قائم کیوں نہ رہا۔ چونکہ یہ نظام نہ تو آگے بڑھ سکا اور نہ ہی آج کہیں قائم ہے اسلئے اس نظام کے احیاء اور از سر نو قیام کی دعوت اور کوشش ایک مقدس آرزو ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہمیں اس خوش عقیدگی سے دامن چھڑا کر اسی قسم کا نظام قائم کر لینا چاہیئے جس قسم کے نظام دنیا کی اور قوموں میں قائم ہیں۔

معترضین کے نزدیک کسی اصول یا نظام کے سچا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس پر تمام انسان یا کم از کم انسانوں کا کوئی گروہ ہمیشہ کاربند رہے اور اسی طرح وہ اصول یا نظام مسلسل آگے بڑھتا چلا جائے۔ یہ دلیل بڑی کمزور اور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر اسے یوں سمجھنا چاہیئے کہ جب سے انسانی شعور بیدار ہوا ہے یہ حقیقت بطور مسلمہ تسلیم کی گئی ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا برا ہے۔ دنیا میں کوئی انسان نہیں جو اس اصول سے انکار کرتا ہو اور انسانی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب اس اصول سے انکار کیا گیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ تمام انسانی تاریخ میں (سوائے جستہ جستہ لمحات کے) کوئی دور بھی ایسا نہیں آیا جس میں انسانوں نے کوئی ایسا نظام قائم کیا ہو جو خالص سچائی پر مبنی ہو۔ آپ گذشتہ تاریخ کو تو چھوڑیئے خود اپنے زمانے پر نگاہ ڈالئے ہر شخص یہ کہتا ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا برا ہے لیکن (قریب قریب) ہر شخص جھوٹ بولتا ہے۔ اگر مندرجہ بالا دلیل کو صحیح مانا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ چونکہ انسانوں نے ہمیشہ سچ نہیں بولا اور آج بھی کوئی نظام ایسا نہیں جو سچائی پر مبنی ہو اس لئے یہ اصول ہی غلط ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا برا۔ چونکہ تمام انسان جھوٹ بولتے ہیں اس لئے صحیح راہ عمل یہی ہے کہ جھوٹ کو محکم اصول تسلیم کر کے اسی کے مطابق زندگی کا نظام بنا لیا جائے۔ اللہ میاں نے یہ کہہ کر کہ جھوٹ بری چیز ہے ایک تجربہ کیا تھا جو (معاذ اللہ) ناکام ثابت ہوا اس کے مقابل میں انسانوں کا نظام جو جھوٹ پر مبنی ہے اچھا بھلا چلتا رہا ہے اس لئے یہی راہ صواب کی ہے۔

اسے بھی چھوڑیئے۔ روزمرہ کی زندگی پر نگاہ ڈالئے۔ ہر ذیابیطس کا مریض اچھی طرح جانتا ہے کہ میٹھا کھانا اس کے لئے موجب ہلاکت ہے لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے (کہ چند مستثنیات کے علاوہ) ہر مریض میٹھا کھا لیتا ہے اور پھر چیختا چلاتا ڈاکٹر کے پاس پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر دوائی دیتا ہے اور میٹھے سے سخت پرہیز بتاتا ہے۔ مریض تین چار دن تک اس پر عمل کرتا ہے اور پھر میٹھا کھانا شروع کر دیتا ہے۔ آپ کی مندرجہ بالا دلیل کی رو سے یہ ماننا پڑے گا کہ چونکہ عام مریض پرہیز شکن واقع ہوئے ہیں اور ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود میٹھے سے باز نہیں آتے اسلئے یہ اصول ہی غلط ہے کہ میٹھا ذیابیطس کے مریضوں کیلئے مہلک ہے۔ صحیح اصول یہ ہے کہ ذیابیطس کے مریض خوب میٹھا کھائیں۔

اب آیئے اس شبہ کی طرف جو اسلام کے متعلق عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہو رہا ہے اور جس کا اظہار اوپر کے خط میں کیا گیا ہے اس شبہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم عام طور پر اسلام اور مسلمانوں کو ایک فرض کر لیتے ہیں۔ ہم نے تاریخ میں دیکھا کہ آج سے چودہ سو برس پہلے ایک خاص خطۂ زمین کے انسانوں نے زندگی کے کچھ اصولوں کو اپنایا اور اس سے نہایت شاندار نتائج برآمد ہو گئے۔ اس کے بعد ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ قوم قعر مذلت میں گر گئی اور اس میں وہی خرابیاں پیدا ہو گئیں جو دنیا کی دوسری قوموں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم اس سے فوراً اس نتیجہ پر پہنچے کہ وہ اصول اس قسم کے تھے کہ ان سے ہنگامی طور پر اچھے نتائج پیدا ہو سکتے تھے لیکن ان میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ مستقل طور پر ان نتائج کو برآمد کرتے رہتے۔ حالانکہ جو کچھ ہوا وہ صرف یہ تھا کہ ایک قوم نے ان اصولوں کو ضابطۂ زندگی بنایا اور

زندگی کی کامیابیاں حاصل کرلیں۔ اسوقت کے بعد اس قوم نے ان اصولوں کو چھوڑ دیا اور ان نتائج سے محروم ہوگئی جو ان اصولوں پر کاربند ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ فرمائیے کہ اس میں ان اصولوں کا کوئی قصور ہے؟ آپ کہتے یہ ہیں کہ چونکہ اس قوم نے ان اصولوں کو ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ نہ رکھا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اصول اس قابل تھے ہی نہیں کہ وہ زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتے۔ لیکن یہ مفروضہ بالبداہت غلط ہے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ وہ اصول زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے چل رہے ہیں یا دنیا انھیں پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ آئی ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس خاص قوم نے تو ان اصولوں کو چھوڑ دیا لیکن انسانیت بحیثیت مجموعی غیر شعوری طور پر انہی اصولوں کی طرف بڑھے چلی جارہی ہے اس کا ثبوت ذیل کی تصریحات سے ملے گا۔

(۱) نزول قرآن کے وقت (یعنی چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں بادشاہت (Monarchy) ایک ایسا مسلمہ نظام حکومت تھا جس کے غلط ہونے کا تصور تک بھی ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ بادشاہ کو "ایشور کا اوتار" اور خود خداوند سمجھا جاتا تھا۔ ہر گردن اسکے حقوق خداوندی (Divine Rights) کے سامنے جھکی ہوئی تھی۔ قرآن نے یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ ملوکیت وجہ فساد آدمیت ہے۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ نہ ہی کوئی انسان پیدائشی طور پر یہ حکم لیکر دنیا میں آتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں سے بڑا سمجھا جائے۔ بڑائی کا معیار جوہر ذاتی ہے نہ کہ نسبی انتساب۔ انسانوں کے باہمی معاملات عدل اور انصاف کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے پانے چاہئیں۔ ایک قوم نے اس اصول کو اختیار کیا اور اس کے انسانیت ساز نتائج سے بہرہ یاب ہوگئی۔ اس کے بعد اس نے اس اصول کو چھوڑ دیا لیکن ذرا یہ دیکھئے کہ اس تیرہ سو سال میں عام انسانیت کا قدم اس اصول کی طرف اٹھتا گیا ہے جو قرآن نے پیش کیا تھا یا اس اصول کی طرف جسے نزول قرآن سے پہلے ایک مسلمہ اصول مانا جاتا تھا۔

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ انسانیت غیر شعوری طور پر اسی راستہ پر بڑھتی چلی آرہی ہے جسے قرآن نے تجویز کیا تھا اور اس راستہ کو چھوڑ چکی ہے (یا چھوڑتی جارہی ہے) جسے انسانوں نے اس سے پہلے اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔ دنیا سے بادشاہتوں کے نام مٹ چکے ہیں اور شاہوں کے تاج آئے دن فضا میں اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو سمجھدار ہیں وہ از خود اس اصول کو اختیار کئے جارہے ہیں جو از خود نہیں چھوڑتے ان سے زمانہ کے تقاضے مار مار کر تخت و تاج چھین رہے ہیں۔ آج دنیا میں شاید ہی کوئی انسان ایسا ہو جو یہ کہے کہ ملوکیت صحیح نظام حکومت ہے۔

ہم اپنے بھائی سے پوچھتے یہ ہیں کہ کیا دنیا قرآن کے تجویز کردہ نظام کو قبول کررہی ہے یا اس نظام کو جو اس سے پہلے انسانوں نے خود وضع کیا تھا۔ اور یہ بھی پوچھتے ہیں کہ کیا قرآن کا دیا ہوا اصول صرف چند دنوں کے لئے چلا تھا یا تیرہ سو سال سے برابر آگے بڑھتا چلا آرہا ہے۔

(۲) نزول قرآن کے وقت ایک مسلمہ اصول یہ تھا کہ کچھ انسان ایسے ہوتے ہیں جو خدا اور بندے کے درمیان واسطہ بنتے ہیں۔ انھیں مذہبی پیشوایا (Preists) کہا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ زلزلہ انگیز آواز بلند کی کہ خدا اور بندے کا تعلق (اس کے ہمہ گیر قانون کی رو سے) براہ راست ہے اور پیشوائیت مفاد پرست انسانوں کا خود ساختہ تصور ہے۔ ایک قوم نے اس اصول کو اپنایا اور ان کے قلوب و اذہان ان

زنجیروں سے آزاد ہوگئے جو پیشوائیت کی عقیدتمندیاں وضع کئے چلی آرہی تھیں اس کے بعد انھوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا اور ملائیت کی لعنت پھر سے ان کے دل و دماغ پر مسلط ہوگئی۔ لیکن آپ دیکھئے کہ آج انسانیت کا رخ اس تصور کو مٹانے کی طرف ہے یا اسے مستحکم کرنے کی طرف۔ آپ دیکھیں گے کہ آج انسان پیشوائیت سے بیزار ہو چکا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔

(۳) نزول قرآن سے پہلے دنیا کے انسان قبیلوں اور قوموں میں بٹے ہوئے تھے اور نسل و جغرافیائی امتیازات انسان اور انسان کے درمیان حد فاصل بن رہے تھے۔ قرآن نے آکر ان تمام خود ساختہ حدود بندیوں کو مٹایا اور انسانوں کو اس اصل عظیم سے روشناس کرایا کہ تمام انسانوں کی پیدائش نفس واحدہ سے ہوئی ہے اسلئے تمام انسان بلا تمیز نسب و وطن ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ ایک خطۂ زمین میں اس اصول کو اپنایا گیا اور دنیا نے دیکھا کہ کس طرح مختلف نسلوں اور مختلف وطنوں کے انسان ایک امت بن گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ اصول فراموش کر دیا گیا اور وہ قوم پھر خود ساختہ گروہ بندیوں میں بٹ گئی۔ لیکن آپ سوچئے کہ آج انسانیت کا قدم ان گروہ بندیوں اور حدود سازیوں کو مستحکم کرنے کی طرف ہے یا ان کو مٹا کر ایک عالمگیر نظام قائم کرنے کی طرف۔ آپ دیکھیں گے کہ آج ہر اہل فکر اسی کوشش میں ہے کہ ان امتیازات کو مٹا کر تمام انسانوں کو ایک برادری میں منسلک کر لینے کا نظام قائم کیا جائے۔ کہئے کہ انسانیت اسلام کے بتائے ہوئے اصول کو اپنا رہی ہے یا اس اصول کو جسے انسانوں نے خود وضع کیا۔

(۴) نزول قرآن سے پہلے سرمایہ داری اور مفاد پرستی ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھا جاتا تھا۔ صاحب اقتدار گروہ رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیتے تھے اور اس طرح زیر دست انسانوں کا خون چوستے تھے۔ قرآن نے یہ انقلاب آفریں اصول پیش کیا کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت میں نہیں دیئے جا سکتے۔ انسانوں کے اجتماعی نظام کی بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ تمام انسانوں کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرے جو نظام اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا اسے باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ایک جماعت نے اس اصول کو اپنایا اور وہ زمین اور آسمان کی برکتوں سے مالا مال ہوگئی اس کے بعد اس نے اسے چھوڑ دیا اور پھر سرمایہ داری اور مفاد پرستی کے جذام میں مبتلا ہوگئی لیکن دیکھئے یہ کہ اس تیرہ سو برس میں عام انسانیت کا رخ سرمایہ داری اور مفاد پرستی کی طرف رہا ہے یا اسے انسانیت کے لئے لعنت قرار دیا جا رہا ہے۔ آج حالت یہ ہے کہ خود پاکستان میں زمین پر افراد کی ملکیت کو قانوناً تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی زمینداروں کے گھروں سے ان کی زمینوں کی پیداوار کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر برآمد کیا جاتا ہے اور اسے نظام اجتماعی کی تحویل میں دیا جاتا ہے تاکہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرے جو زمیندار اپنے غلہ کی مقدار سے حکومت کو مطلع نہیں کرتا یا غلہ کی برآمدگی میں رکاوٹ ڈالتا ہے اسے گرفتار کیا جاتا ہے اور سزا کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے اس قسم کے زمیندار ہر شخص کی نگاہ میں سوسائیٹی کے بدترین مجرم تصور کئے جاتے ہیں۔ یعنی ایک طرف زمین پر ان کا حق ملکیت بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور دوسری طرف انھیں اس کی قطعاً اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زمین کی پیداوار کو اپنی ملکیت میں رکھ سکیں حتیٰ کہ اب یہ بھی تجویز ہے کہ اس قسم کا قانون بنا دیا جائے کہ زمینداروں کو اس کی اجازت نہ ہو کہ اپنی زمینوں میں جو کچھ جی میں آئے کاشت کریں انھیں مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی زمین میں وہ کچھ کاشت کریں جس کی اہل ملک کو ضرورت ہو۔ آپ نے دیکھا کہ زمانے کے

تقاضے کس طرح مار مار کر انسانی نظام کو قرآنی اصولوں کی طرف لا رہے ہیں۔ کہئے کہ انسان خدا کے دیئے ہوئے اصولوں کو اختیار کر رہا ہے یا اپنے خود ساختہ نظام کو۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ پیش نظر مقصد کے لئے اتنی مثالیں ہی کافی ہیں، ان سے ظاہر ہے کہ قرآنی اصول اپنی اندرونی قوت سے از خود انسانی معاشرہ کی بنیادیں بنتے چلے جا رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان اصولوں کے اس طرح نافذ العمل ہونے کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔ کیونکہ انسان انھیں مختلف تجربوں کے بعد اختیار کرتا ہے جس میں بہت زیادہ وقت بھی صرف ہوتا ہے اور فساد انگیزیوں اور خونریزیوں سے اس کی بہت سی قوتیں بھی ضائع ہو جاتی ہیں۔ اگر انسان وحی پر ایمان لا کر ان اصولوں کو بلا تجربہ اختیار کر لے تو ان کے نتائج کے رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے اور ان میں زیادہ قوت بھی صرف نہیں ہوتی۔

اب مراسلہ نگار کے خط کا وہ حصہ سامنے آتا ہے جس کا تعلق تاریخ سے ہے نہ کہ اسلامی نظام کے اصولوں سے۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کے اصولوں میں یہ قوت موجود تھی کہ وہ ایک دفعہ قائم ہونے کے بعد مسلسل آگے بڑھتے چلے جاتے لیکن یہ اصول جب انسانی ہاتھوں سے قائم ہوئے تھے تو انسانی ہاتھوں سے ہی آگے بڑھ سکتے تھے۔ اگر انسانی ہاتھوں نے انھیں آگے نہ بڑھایا بلکہ ان کو چھوڑ دیا تو یہ انسانی ہاتھوں کا نقص ہے نہ کہ قرآنی اصولوں کا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ میں کیا گذری، بنو امیہ اور سادات میں کیا آویزش ہوئی۔ دمشق اور بغداد کے مناقشات نے کیا شکل اختیار کی، مسلمانوں کی جماعتیں کس طرح ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوئیں یہ تمام حصہ ایک قوم کی تاریخ سے متعلق ہے نہ کہ قرآنی اصولوں سے۔ اس کے متعلق قرآن کا صرف ایک فیصلہ ہے اور وہ یہ کہ

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲/۱۴۱)

یہ ایک قوم تھی جو گذر چکی جو کچھ انھوں نے کیا اس کے نتائج ان کے لئے تھے اور جو کچھ تم کرو گے اس کے نتائج تمہارے لئے ہیں۔ تم سے قطعاً یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انھوں نے کیا کیا تھا۔

اسلئے آج ہمارے لئے اس بحث میں الجھنا ہی بیکار ہے کہ انھوں نے کیا کیا اور کیوں ایسا کیا۔ طلوع اسلام سے کبھی یہ "سعی لاحاصل" سرزد نہیں ہوئی کہ "آج پونے چودہ سو سال کے بعد ان واقعات کو نوچ نوچ کر ان کے گھناؤنے پن کو دور کرے" وہ اتنا ضرور کہتا ہے کہ جو چیز فی الحقیقت گھناؤنی نہ تھی لیکن جسے بعد کی سازشوں نے خواہ مخواہ گھناؤنا بنا کر پیش کیا اسے اس گھناؤنے پردہ کو چاک کر کے اس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ ولو کرہ المشرکون۔

اب رہا یہ سوال کہ ہماری یہ کوشش ایک واہمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ قرآنی نظام پھر سے قائم ہو جائے کیونکہ ہم "اصحاب عشرہ مبشرہ نہیں بن سکتے" سو عرض یہ ہے کہ قرآنی نظام کسی "خاص عشرہ مبشرہ" کا محتاج نہیں۔ اسے ہر زمانہ میں قائم

کیا جاسکتا ہے اور جن انسانوں کے ہاتھوں سے اس کا قیام عمل میں آئے گا وہی مبشرین بن جائیں گے۔ آپ یہ فرماتے ہیں کہ جب وہ نظام حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں قائم نہ رہا تو ہم اسے کس طرح قائم کرسکتے ہیں لیکن ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ جب وہ نظام حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے زمانے میں دو انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہوگیا تھا تو وہی نظام آج بھی قائم ہوسکتا ہے۔ عمرؓ کو عمرؓ اس نظام کی برکتوں نے بنا دیا تھا نہ یہ کہ عمرؓ نے اس نظام میں وہ برکتیں پیدا کردی تھیں۔ وہ نظام اپنی تمام ممکنات کو لئے ہوئے آج بھی اسی طرح موجود ہے جو انسان چاہیں اس سے اسی قسم کی برکات حاصل کرکے وہی کچھ بن سکتے ہیں جو کچھ اس نے اس سے پہلے بنایا تھا۔ قرآن کے محفوظ رکھنے کے معنی ہی یہی ہیں کہ یہ نظام ہر دور کے انسانوں کے ہاتھوں نافذ العمل ہوسکتا ہے۔ یہ وہ حقیقت تھی جس کی طرف حضرت ابوبکرؓ نے عام مسلمانوں کی توجہ اس وقت مبذول کرائی تھی جب رسول اللہ صلعم کی وفات سے ان کے ذہنوں میں اس خدشہ کے پیدا ہونے کا امکان نظر آتا تھا کہ اب یہ نظام آگے نہیں چل سکے گا۔ عین اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا تھا کہ یہ نظام کسی خاص شخصیت کے سہارے سے وابستہ نہیں۔ یہ زندہ خدا کا دیا ہوا زندہ نظام ہے۔ جو ان تمام انسانوں کے ہاتھوں سے قائم رہ سکتا ہے جو اسے قائم رکھنا چاہیں اور اس پر انھوں نے قرآن کی یہ آیت پیش کی تھی کہ

وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل۔ افإن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم۔

محمدؐ صرف ایک رسول تھے جن سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ مر گئے یا قتل ہوگئے تو تم اپنی ایڑیوں کے بل پلٹ جاؤ گے؟

آپ لکھتے ہیں کہ اس نظام کو ختم کرنے سے اللہ کا منشاء یہ تھا کہ ایک آئین کو ختم کرکے دوسرا بہتر آئین نافذ کردیا جائے گا۔ سو اول تو یہ دیکھئے کہ آپ خود اس کا رونا رو رہے ہیں کہ اسلام کا بہترین نظام ختم ہوا تو اس کے بعد اس قوم نے وہ نظام اختیار کرلیا جو تمام برائیوں کا منبع تھا اور اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ خدا کی مشیت یہ تھی کہ اس نظام کو ختم کرکے اس سے بہتر نظام قائم کردیا جائے۔ ان دونوں چیزوں میں جو تضاد ہے وہ واضح ہے۔ اصل یہ ہے کہ آپ بھی اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ اسلامی نظام ایک جامد (Rigid) نظام ہے جو انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا اسلئے ضرورت ہے کہ ایک نظام کو ختم کرکے اس کی جگہ دوسرا نظام دیا جائے اور یہ سلسلہ اسی طرح آگے چلتا رہے۔ ذرا یہ سمجھ لیجئے کہ اسلامی نظام کہتے کسے ہیں۔ یہ تو آپ کو بھی تسلیم ہوگا کہ دنیا میں بعض اصول ایسے ہیں جو ابدی طور پر قائم رہتے ہیں مثلاً عدل کا اصول، دیانتداری کا اصول۔ آپ یقیناً اس سے متفق ہوں گے کہ یہ اصول ایسے نہیں ہیں کہ ایک نظام ان کے مطابق قائم کیا جائے اور کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کو چھوڑ کر ایک دوسرا نظام قائم کیا جائے جو ظلم اور بددیانتی کے اصولوں پر استوار ہو۔ زمانہ کتنا ہی آگے بڑھتا چلا جائے عدل اور دیانت کے اصول اپنی جگہ پر قائم رہیں گے۔ اسی قسم کے اصولوں کو مستقل اقدار (Permanent Values) کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی قسم کے کچھ اصول دیئے ہیں جو غیر متبدل ہیں اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت اور عقل و فکر کی رو سے اپنا نظام آپ وضع کریں ظاہر ہے کہ وہ غیر متبدل اصول جن کی طرف اوپر اشارہ

کیا گیا ہے، ہمیشہ برقرار رہیں گے اور ان کی روشنی میں وضع کردہ نظام انسانیت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلتا چلا جائے گا۔ اب آپ فرمائیے کہ اس قسم کے نظام میں آپ کو کونسی چیز قابل اعتراض نظر آتی ہے اور اسے آپ کس طرح سے ناقابل عمل تصور کرتے ہیں۔ کہ جو صرف ایک مرتبہ قائم ہو سکا اور اس کے بعد دوبارہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ جب آپ اسلامی نظام کا ذکر کرتے ہیں تو آپ کے ذہن میں مُلّا کا پیش کردہ نظام شریعت ہوتا ہے جو یکسر قرآنی نظام کی نقیض ہے۔ یہ تمام اعتراضات جو آپ نے اسلامی نظام پر وارد کئے ہیں مُلّا کے نظام شریعت پر وارد ہوتے ہیں جس کی تمام جزئیات ناقابل تغیر و تبدل قرار دی جاتی ہیں۔ آپ اس قرآنی نظام کو سامنے رکھئے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور پھر فرمائیے کہ آپ کے اعتراضات میں سے کونسا اعتراض باقی رہ جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اسلامی نظام شیعہ سنی، وہابی۔ مرزائی۔ چکڑالوی میں سے کس کے مطابق ہوگا اور اس میں باقی فرقوں کو کیا کیا جائے گا۔ آپ کو غالباً اس کا علم نہیں کہ شیعہ سنی وغیرہ کے اختلافات ملا کی شریعت کے پیدا کردہ ہیں۔ قرآن میں جا کر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ یہ صرف ہماری خوش عقیدگی ہی نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری ہے جسے ہم ہر وقت ثابت کر سکتے ہیں۔ قرآن پر مسلمانوں کے ہر فرقہ کا ایمان ہے اس لئے ہر مسلمان کے لئے قدر مشترک (Common factor) بن سکتا ہے۔ قرآن کے اصولوں میں بھی کسی کو اختلاف نہیں لہٰذا اس حد تک بھی تمام مسلمان ایک نقطہ پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اب رہیں وہ جزئیات جو قرآنی اصولوں کی روشنی میں طے ہوں گی تو اس کیلئے ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے عقل و فکر کی رو سے طے پائیں گی لہٰذا جو چیز باہمی مشاورت سے طے پا جائے اس میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اب صرف یہی سوال باقی رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس بنیادی نقطہ پر کس طرح لایا جائے کہ ان کا نظام قرآن کے اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے پائے گا یہی وہ چیز ہے جس کے لئے طلوع اسلام کوشش کر رہا ہے۔ جو احباب اس مسلک کو صحیح سمجھتے ہیں ان کیلئے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ طلوع اسلام کی اس کوشش میں اس کا ہاتھ بٹائیں۔

آخر میں ہم اپنے بھائی سے اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے اپنے خط میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی وجہ سے ہم آپ کے خلاف کوئی سخت الفاظ استعمال کرنا نہیں چاہتے اس لئے کہ ان خیالات کے ذمہ دار آپ خود نہیں ہیں، ان کا ذمہ دار ہے اسلامی نظام کا وہ تصور جو ملا نے پیش کر رکھا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف اس قسم کے خیالات پیدا ہوں۔ نوجوان بیچارے معذور ہیں ایک طرف انھیں کالجوں میں ہیگل کا فلسفہ اور آئن سٹائن کے نظریات پڑھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف ان کے سامنے مذہب کا وہ تصور پیش کیا جاتا ہے جس سے عقل رہا کرے اور علم شرمائے۔ اگر اس کے بعد ان کے دل میں مذہب کی طرف سے نفرت اور اس کے تصورات کی طرف سے سرکشی کے جذبات نہ پیدا ہوں تو اور کیا ہوگا۔ اس لئے ہمارا نوجوان طبقہ قابل نفرت نہیں مستحق ہمدردی ہے اور اسی ہمدردی کا تقاضہ ہے کہ ہم ان سے درخواست کیا کرتے ہیں کہ وہ مُلّا کے پیش کردہ مذہب کے بجائے قرآن کے دیئے ہوئے دین کے تصورات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس باب میں جتنی حقیر سی کوشش طلوع اسلام کر سکتا ہے وہ اس سے کبھی دریغ نہیں کرے گا کیونکہ اس کا حقیقی مخاطب طبقہ نوجوانوں ہی کا گروہ ہے۔

حقائق و عبر

(۱) نبوتِ جدیدہ

دین میں جیسا کہ آپ جانتے ہیں حجت صرف سند کو حاصل ہے۔ حجت کے معنی ہیں ایسی دلیل جس سے آپ انکار نہ کر سکیں۔ اور سند سے مراد ہے قرآن کریم یعنی جب آپ یہ کہیں کہ فلاں معاملہ میں دین کا حکم یہ ہے تو آپ کو یہ بتانا پڑے گا کہ اس حکم کے لئے آپ کے پاس قرآن کی کونسی سند ہے۔ ایسی کسی سند کے بغیر کسی کا کوئی قول دین میں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

قرآن سے نیچے اترے تو بعض لوگوں نے حدیث کو بھی اسی قسم کی سند تصور کر لیا چنانچہ ان لوگوں کا مسلک یہ قرار پایا کہ جب کوئی یہ کہے کہ اسلام میں فلاں معاملہ کے متعلق یہ حکم ہے تو اس سے قرآن کے بعد یہ بھی پوچھا جا سکے گا کہ اس کی سند میں تمہارے پاس کونسی حدیث ہے۔

اور آگے بڑھے تو بعض لوگوں نے قرآن (یا قرآن و حدیث) کے اصولی احکام سے جزئی احکامات مستنبط کئے اور اس استنباط میں اپنے قیاس سے کام لیا اسے فقہ کہتے ہیں۔ لیکن جب اہل فقہ سے بھی پوچھا جائے تو انھیں بھی یہ بتانا ہوتا ہے کہ انھوں نے کسی مسئلہ کے متعلق اس حکم کو قرآن کی کس آیت یا کس حدیث پر قیاس کر کے مستنبط کیا ہے۔ یعنی سند سے یہ گروہ بھی بے نیاز نہیں۔

اس سے آگے بڑھے تو بعض لوگوں نے ان فقہا کے فیصلوں کو دین میں سند تسلیم کر لیا چنانچہ جب ان سے پوچھا جائے کہ تم کس طرح کہتے ہو کہ فلاں بات میں اسلام کا فیصلہ یہ ہے تو وہ اپنے قول کی تائید میں کسی نہ کسی امام کا فیصلہ بطور سند کے پیش کریں گے۔ لیکن اس نقطۂ خیال کا بھی اگر تحلیل و تجزیہ کیا جائے تو اس کی تہ میں بھی یہی عقیدہ کارفرما نظر آئے گا کہ ہمارا امام یا ہمارا مجتہد اپنی طرف سے خود کچھ نہیں کہتا بلکہ جو کچھ کہتا ہے وہ قرآن و حدیث ہی کو سامنے رکھ کر کہتا ہے۔ چنانچہ آپ ہر فقیہ سے یہ مطالبہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان کے امام کے اس فیصلہ کی کیا سند ہے جس پر وہ فقیہ آپ کو قرآن یا حدیث سے اپنے امام کے اس فیصلہ کی سند پیش کر دے گا۔ چنانچہ فقہ کی کتابیں ان کے ان دلائل سے بھری پڑی ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ دین کے معاملہ میں چودہ سو سال سے آج تک سند ضروری رہی ہے۔ آپ کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے کہ دین میں فلاں چیز (حدیث۔ یا قیاس۔ یا کسی امام کا قول) سند ہو سکتا ہے یا نہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ دین میں سند کا ہونا لاینفک ہے کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے سے یہ کہے کہ دین کا یہ حکم یوں اسلئے ہے کہ میں ایسا کہتا ہوں۔

یہ ہے وہ اصل عظیم جس پر دین کی بنیاد قائم ہے یعنی کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے اپنا قول بطور دینی حکم کے منوائے۔ اور ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ہر دوسرے شخص سے یہ پوچھ لے کہ جس بات کو تم دین کا حکم کہتے ہو اس کی سند تمہارے پاس کیا ہے؟

حتی کہ ایک نبی اور رسول کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی سے یوں کہہ سکے کہ دین کا یہ حکم یوں اس لئے ہے کہ میں ایسا کہتا ہوں۔ اس کو بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ دین کا یہ حکم اسلئے ہے کہ خدا کا ایسا ہی حکم ہے۔

ما کان لبشر ان یؤتیہ اللہ الکتٰب والحکم والنبوۃ ثم یقول للناس کونوا عبادًا لی من دون اللہ ولکن کونوا ربانیّٖن بما کنتم تعلمون الکتٰب وبما کنتم تدرسون۔ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے (انسان کی ہدایت کے لئے) کتاب اور حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے، خدا کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ (یعنی خدا کے احکام کی جگہ میرے حکموں کی اطاعت کرو) بلکہ چاہئے کہ ربانی انسان (یعنی خلق اللہ کے مرشد و مربی) بنو، اسلئے کہ تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے ہو اور اس لئے کہ اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

آپ نے دیکھ لیا کہ دین کے ہر حکم کے لئے رسول کو بھی خدا کی طرف اپنی سند بیان کرنی پڑتی ہے یعنی اسے بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ چونکہ خدا کا یہ حکم ہے اسلئے میں ایسا کہہ رہا ہوں۔

البتہ نبی کا صرف ایک دعوٰی ایسا ہوتا ہے جہاں سند یا دلیل طلب نہیں کی جا سکتی اور یہ اس کا دعوائے نبوت ہوتا ہے۔ اس کا یہ دعوٰی کہ خدا نے اسے ایک ایسی چیز عطا کی ہے جسے وحی کہا جاتا ہے۔ اس دعوے کے لئے دراصل رسول کا اپنا دعوٰی ہی سند ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں رسول پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جب رسول یہ کہے کہ خدا نے مجھے یہ حکم دیا ہے تو ہمیں یہ تسلیم کرنا ہو کہ خدا نے واقعی یہ حکم دیا ہے یعنی رسول کا وہ حکم اُسے خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملا ہے۔

بہرحال دین میں ایک مقام نبوت ہی ایسا مقام ہے جہاں سند کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر یہ نکتہ یاد رہے کہ سند کا یہ مطالبہ صرف اس امر میں نہیں کیا جا سکتا کہ وہ حکم اس کو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملا ہے۔ اور بس۔

یہاں سے آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اگر کوئی شخص آج اس قسم کا ادعا کرتا ہے کہ اس کا حکم دین میں اسلئے واجب التعمیل ہے کہ وہ ایسا کہتا ہے تو دراصل وہ اپنے لئے مقام نبوت کا دعویدار ہے بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر کیونکہ اس ادعا کا حق تو ایک نبی کو بھی حاصل نہیں ہے بلکہ اسے بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ چونکہ خدا نے ایسا حکم دیا ہے اسلئے میں ایسا کہتا ہوں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ باب نبوت بند ہو گیا اس لئے اب رسول اللہ کے بعد کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں رہا کہ وہ بلا سند کوئی بات دین کی حیثیت سے کسی سے منوا سکے۔ یہ ایک ایسی حقیقت کبرٰی ہے جس میں آج تک کسی کو اختلاف کرنے کی جرات نہیں ہوئی۔

البتہ صوفیہ میں سے بعض حضرات نے ضرور یہ کہا ہے کہ مجھے فلاں فلاں بات کشف یا الہام کے ذریعہ سے معلوم ہوئی ہے اور کشف یا الہام ایک ایسی چیز ہے جس کی تائید میں کوئی سند یا دلیل پیش نہیں کی جا سکتی مگر سب کو معلوم ہے کہ آج تک کشف و الہام کو

لہ واضح رہے کہ یہ ترجمہ ہمارا نہیں بلکہ مولانا ابوالکلام صاحب آزاد کا ترجمہ ہے ۱۲

دین میں کسی نے بھی حجت قرار نہیں دیا حتیٰ کہ خود صاحب کشف اپنے کشف کو خود اپنے لئے بھی دینی حجت نہیں مانتا۔

بہرحال تیرہ سو برس سے امت میں یہ مسلک متفقہ طور پر چلا آرہا تھا یعنی یہ مسلہ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دین کے معاملہ میں اپنی بات کو بغیر سند کے منوا سکے یعنی وہ یہ کہے کہ جس بات کو میں صحیح کہدوں وہ صحیح ہے اور جس بات کو میں غلط کہوں وہ غلط ہے۔ تیرہ سو سال کے بعد اس مسلمہ کو مرزا غلام احمد قادیانی نے توڑا۔ کس طرح توڑا؟ یہ داستان بڑی دلچسپ ہے۔ مرزا غلام احمد نے کبھی یہ نہیں کہا کہ میں قرآن اور حدیث کو نہیں مانتا بلکہ وہ اپنے ہر دعوے کے لئے کتاب وسنت اور قرآن وحدیث کے الفاظ دہراتا رہتا تھا۔ اس کی تمام تصانیف ان الفاظ سے بھری پڑی ہیں لیکن اس نے ایک ایسا چور دروازہ کھول لیا جس کی رو سے قرآن اور حدیث سند بننے کے بجائے خود مرزا صاحب کے فیصلوں کے تابع ہو جائے اس کے لئے صغریٰ اور کبریٰ کی ضرورت تھی۔ صغریٰ تو ملا کے مذہب نے گھڑا گھڑایا اس کے لئے پہلے سے تیار رکھ چھوڑا تھا۔ یعنی وحی کی دو قسمیں ہیں ایک متلو اور دوسرے غیر متلو۔ دونوں ہم پایہ ہیں اور دین میں دونوں کی حیثیت ایک ہے۔ لیکن چونکہ وحی غیر متلو (حدیث) قرآن کی تشریح کرتی ہے اس لئے اگر ان دونوں میں کہیں اختلاف نظر آئے تو حدیث کو راجح تسلیم کرنا ہوگا اور ماننا پڑے گا کہ قرآن کا حکم منسوخ ہے۔ اس طرح قرآن کو ایک طرف بالائے طاق رکھا جا چکا تھا اور دین کی اصلی سند حدیث قرار پا گئی تھی۔ اس کے بعد مرزا صاحب کو صرف کبریٰ اپنی طرف سے لگانا تھا۔ اس کبریٰ کے بھی دو جزو تھے۔ پہلا جزو یہ تھا حدیثیں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی۔ کبریٰ کے اس جزو میں بھی ملا کا مذہب کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا تھا کیونکہ اس کے ہاں خود اس موضوع پر بے شمار ذخیرہ کتابوں میں مدون موجود تھا فرق مختلفہ اور پھر مذاہب اربعہ کے اختلافات نے احادیث کی تصحیح وتغلیط کا پہلے ہی بازار گرم کر رکھا تھا۔ سنیوں کے نزدیک شیعوں کی حدیثیں غلط اور موضوع تھیں اور شیعوں کے ہاں سنیوں کی۔ یہی حال جبریہ قدریہ معتزلہ جہمیہ فرقوں کے ساتھ تھا پھر سنیوں میں بھی ایک حدیث حنفیوں کے ہاں صحیح تھی تو شافعیوں کے ہاں غلط تھی۔ دوسری حدیث مالکیوں کے ہاں صحیح تھی تو حنبلیوں کے ہاں ضعیف اور موضوع تھی۔ اسلئے ملا کا مذہب گیارہ سو سال سے جس اکھاڑے کو جائے چلا آرہا تھا آج اس سے انکار کیسے کر سکتا تھا۔ مرزا صاحب کو کبریٰ کا صرف ایک آخری جزو وضع کرنا پڑا۔ یعنی جب یہ سوال پیدا ہوا کہ صحیح حدیثیں کونسی ہیں اور غلط کونسی تو انھوں نے کہدیا کہ جس حدیث کو میں صحیح کہوں وہ حدیث صحیح ہے اور وہی دین میں سند ہے اور جسے میں غلط کہدوں وہ غلط ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن وحدیث پر کس طرح بجر بٹو گھمایا گیا ہے اور اپنے فیصلوں کو دین کی سند بنا دیا گیا ہے جس کے لئے کسی دوسری سند کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی کا نام درحقیقت نبوت تھا مگر احتیاطاً اسے ظلی نبوت سے تعبیر کیا گیا اس فرق کے ساتھ کہ اصل کی حیثیت محض سائے کی رہ جائے اور سایہ ہی اصل قرار پا جائے۔ احادیث کا ذخیرہ ایک بے پناہ جنگل تھا جس میں سے ہر مسلک کے لئے چسپاں ہو جانے والی روایات چھانٹی جا سکتی تھیں چنانچہ مرزا صاحب نے ان ہی احادیث کی مدد سے اپنی ظلی اور بروزی نبوت کہیں مسیحیت موعودہ اور کہیں مجددیت ومہدویت کے مختلف ڈھونگ رچائے اور ملا ان کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔ وہ چلایا بھی تو صرف یہ چلایا کہ مرزا صاحب یہ حدیثیں تو موضوع ہیں۔ ضعیف ہیں۔ غلط ہیں۔ ان کے مقابلہ میں دوسری صحیح حدیثیں موجود ہیں جن سے ان تمام باتوں

کی تردید ہوتی ہے مگر مرزا صاحب نے کمال حقارت کے ساتھ للکار کر اس کا منہ بند کر دیا کہ

جو شخص حکم ہو کر آیا ہے اس کو اختیار ہے کہ حدیثوں کے ذخیرہ میں سے جس انبار کو چاہے خدا سے علم پا کر قبول کرے اور جس ڈھیر کو چاہے خدا سے علم پا کر رد کر دے (تحفہ گولڑویہ ص۱۰۱)

یعنی حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کی سند خود مرزا صاحب کا وہ علم ہے جو انھوں نے خدا کی طرف سے پایا۔ لہٰذا ذخیرہ احادیث میں سے جو بقول قادیانیت

حدیثوں کی کتابوں کی مثال تو مداری کی پٹاری کی ہے۔ جس طرح مداری جو چاہتا ہے اس میں سے نکال لیتا ہے اسی طرح ان سے جو چاہو نکال لو۔ (الفضل قادیان بابت ۱۵ جولائی ۱۹۳۴ء)

مرزا صاحب نے جو چاہا نکال لیا اور صحیح قرار دیدیا۔ کون تھا جو ان کی زبان پکڑ سکتا تھا۔ حدیث کے پردہ میں مرزا صاحب نے اپنا سکہ چلا دیا اور مجددیت، مہدویت اور ظلی اور بروزی نبوت منواتے چلے گئے۔ یہ تھیں وہ سیڑھیاں جن سے مرزا صاحب نبوت کے بامِ بلند تک پہنچ گئے۔

آج بعینہٖ انہی سیڑھیوں سے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب بھی مشقِ نبوت فرما رہے ہیں۔ مودودی صاحب نے بھی پہلے یہی کہا کہ وحی دو قسم کی ہے۔ ایک کا مجموعہ قرآن ہے اور دوسری کا مجموعہ حدیث۔ پھر یہ کہا کہ حدیثیں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی اور اس کے بعد یہ فرمایا کہ صحیح حدیثیں وہ ہیں جنھیں مزاج شناسِ نبوت صحیح کہدے اور غلط وہ جنھیں وہ غلط ٹھہرا دے۔ اس طرح کتاب وسنت اور قرآن وحدیث کی رٹ لگاتے ہوئے وہ اسی مقام تک پہنچ چکے ہیں جہاں قرآن اور حدیث خود ان کے فیصلوں کے تابع ہو جائے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرتِ رسول کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جس کی کیفیت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بحیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتا دیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین نبوت کا مزاج ہے جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ[1] کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرمؐ کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خود بخود اس کی بصیرت بتا دیتی ہے کہ ان میں کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنت نبویہ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو

---

[1] مرزا صاحب کا دعویٰ بھی یہی تھا کہ میں نے رسول اللہ کی ایسی اطاعت کی ہے کہ اس سے میرے اندر ایسا علم پیدا ہو گیا ہے جس کی بنا پر میں اسناد سے بے نیاز ہو کر خود معیار بن گیا ہوں، اور اسی کو ملکۂ نبوت کہتے ہیں۔ ۱۲

قرآن وسنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اسلئے کہ اس کی روح، روح محمدی میں گم اور اس کی نظر بصیرت نبوی کے ساتھ متحد[1] ہو جاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلہ کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب ضعیف، منقطع السند مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے۔ اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل۔ غیر شاذ متصل السند مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔

(تفہیمات حصہ اول صفحہ ۳۲۳، ۳۲۴)۔

آپ مرزا صاحب کے مذکورہ بالا اقتباس اور مودودی صاحب کی ان تصریحات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر دیکھئے اور سوچئے کہ مودودی صاحب کا یہ مسلک کسی طرح بھی مرزا صاحب کے اس مسلک سے مختلف ہے؟ "مزاج شناسئ نبوت" اور "بصیرت نبوی" ایسی چیزیں ہیں جن پر کوئی دلیل یا سند نہ پیش کی جا سکتی ہے نہ مانگی جا سکتی ہے۔ اس کے لئے کسی ایک کا اتنا کہہ دینا ہی کافی ہے کہ میری مزاج شناسئ نبوت یا بصیرت نبوی کا یہی فیصلہ ہے۔ اور اس کا یہ فیصلہ بیک جنبش ابرو "دین" بن سکتا ہے۔ "بس اک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دیں کا"۔ یہ وہ مقام ہے جو صرف ایک نبی ہی کو حاصل ہو سکتا ہے کہ وہی اپنی بات کو بحیثیت دین کے بغیر کسی سند و دلیل کے منوا سکتا ہے۔ چودہ سو سال سے امت میں آج تک کسی کو یہ مقام حاصل نہیں ہوا۔ امت میں بڑے بڑے اولوالعزم خلیفہ۔ بادشاہ۔ امام۔ فقیہ۔ اولیاء اللہ ہو چکے ہیں مگر مرزا صاحب اور مودودی صاحب سے پہلے کسی نے اپنے لئے یہ پوزیشن حاصل کرنے کی جرأت نہیں کی۔ ان دونوں میں فرق اتنا ہی ہے کہ اول الذکر اپنی اس پوزیشن کو ظلی اور بروزی نبوت سے تعبیر کرتا ہے اور ثانی الذکر "مزاج شناسئ نبوت" یا "بصیرت نبوی" بلکہ "اپنی روح کو روح محمدی میں گم" ہو جانے اور "اپنی نظر کو بصیرت نبوی کے ساتھ متحد" ہو جانے سے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ محض تعبیرات کا فرق ہے۔ اس تعبیری فرق سے حقیقت نہیں بدلی جا سکتی۔ اس تفصیل کے بعد ہم ناظرین سے پوچھتے ہیں کہ وہ خود فیصلہ کریں کہ ان دونوں مدعیوں میں کیا فرق ہے۔ کیا دونوں کا مطمح نظر اور منزل مقصود ایک ہی نہیں ہے؟

طلوع اسلام بار بار متنبہ کرتا رہا ہے اور اب پھر ملت کو متنبہ کرتا ہے کہ خدا کے لئے ان چور دروازوں کو بند کرو۔ دین کی بنیاد صحیح قرآن اور فقط قرآن ہے جو ابد الآباد تک کے لئے واجب العمل ہے۔ روایات اس عہد مبارک کی تاریخ ہیں کہ رسول اللہ صلعم والذین معہ نے اپنے عہد میں قرآنی اصول کو کس طرح متشکل فرمایا تھا۔ یہ اس عہد مبارک کی شریعت ہے۔ قرآنی اصول کی روشنی میں کسی فرد واحد کو جزئیات مستنبط کر کے اپنے عہد کے لئے شریعت بنا دینے کا حق نہیں ہے خواہ وہ کتنا ہی اتباع محمدی (بقول مرزا) یا کتنا ہی مزاج شناسئ رسول (بقول مودودی) کا دعویدار کیوں نہ ہو۔ بلکہ یہ حق صرف صحیح قرآنی خطوط پر قائم شدہ مرکز ملت اور اس کی مجلس شوریٰ کا ہے کہ وہ قرآنی اصول کی روشنی میں صرف ان جزئیات کو مرتب و مدون کر سکے جن کی قرآن نے کوئی تصریح نہیں کی۔ پھر یہ جزئیات

---

[1] مرزا صاحب نے اسی کا نام ظلی اور بروزی نبوت رکھا ہے۔ ۱۲۔

ہر زمانہ میں ضرورت پڑنے پر تبدیل کی جا سکتی ہیں۔ یہی اپنے زمانہ کے لئے شریعت ہیں۔

مرزا صاحب کی نبوت نے جو فتنہ برپا کیا تھا اس وقت اس کے خلاف ملت کی طرف سے بڑی سختی کے ساتھ صدائے احتجاج بلند ہو رہی ہے لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ جتنے عرصہ میں وہ اس پرانی نبوت کے فتنہ کا استیصال کریں گے اس وقت تک پنجاب کی یہ نئی نبوت اپنے شباب تک پہنچ چکی ہوگی۔ مسلمانوں نے نہ اس پرانی نبوت کے خلاف بروقت آواز اٹھائی اور نہ وہ اب اس نئی نبوت کا کچھ احساس کر رہے ہیں۔ پرانی نبوت کا مدعی بھی شروع میں شریعت محمدی کے احیاء کا مدعی تھا اور مسلمان اسی دھوکہ میں اس کے اصلی عندیہ سے بے خبر رہے۔ یہ نئی نبوت بھی نظام شریعت کے قیام کی آڑ میں مضبوط ہوتی چلی جارہی ہے اور ملت کو اس کا اس وقت احساس ہوگا جب یہ پوری طرح اپنی جڑیں پکڑ چکے گی۔ یہ نبوت اس پہلی نبوت سے بھی زیادہ خطرناک ہوگی اس لئے کہ اس نبوت نے اپنی نشر و اشاعت محض نجی طور پر کی تھی لیکن یہ نبوتِ جدیدہ حکومت کا اقتدار حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔ سوچئے کہ اگر زمام اقتدار ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں آجائے جو یہ کہے کہ صحیح وہ ہے جسے میری نگاہ صحیح کہدے اور غلط وہ جسے میں غلط قرار دیدوں تو کیا اس کے بعد یہاں قرآن، اور حدیث کی کوئی حقیقت بھی باقی رہ جائیگی؟

چھوڑیئے طلوع اسلام کو کہ وہ تو ان لوگوں کے نزدیک منکر حدیث ہے مگر ہم پوچھتے ہیں حامیانِ حدیث سے کہ کیا اس نظریہ کے بعد ان کی حدیث کی بھی کوئی حیثیت باقی رہ جاتی ہے؟ طلوع اسلام تو اتنا ہی کہتا ہے کہ صحیح اور غلط کا معیار قرآن ہے صحیح وہ ہے جسے قرآن صحیح کہدے اور غلط وہ جو اس کے ہاں سے غلط قرار پاجائے اُسے تو آپ منکر حدیث کہتے ہیں لیکن اس کے برعکس ایک شخص یہ کہتا ہے کہ "تمہارے اپنے معیاروں کے مطابق صحیح قرار دیئے ہوئے احادیث کے مجموعے صحیح نہیں قرار دیئے جاسکتے جب تک ان کی صحت کے متعلق میری بارگاہ سے فتویٰ نہ صادر ہو جائے۔ ان ذخیروں میں سے جس کو میں صحیح کہدوں وہ صحیح ہے اور جسے میں غلط قرار دیدوں وہ غلط ہے" تو اس شخص کو آپ سب سے بڑا حامی حدیث اور محی السنۃ قرار دے رہے ہیں۔

لالہ ساغر گیر و نرگس مست و بر ما نام فسق

لہذا ختم نبوت کے محافظین اور حامیانِ حدیث دونوں کے لئے سوچنے کا مقام ہے کہ یہ نیا فتنہ انھیں کہاں تک پہنچائے گا۔ نیز وہ لوگ جو پاکستان میں نظام شریعت کے قیام کے متمنی ہیں سوچیں کہ نظام شریعت کے قیام کی آڑ میں یہاں کس قسم کی مستبد ڈکٹیٹر شپ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ وہ ڈکٹیٹر شپ جس میں ڈکٹیٹر کا فیصلہ ایک انسانی حکم نہیں ہوگا بلکہ خدا اور رسول کا حکم قرار دیا جائیگا اور جس سے سرتابی دنیا میں پھانسی کے تختے اور آخرت میں نار جہنم کی متوجب ہوگی!

۲۔ وہی مرحبی وہی عنبری

قرآن کریم میں ہے کہ جب حضرات انبیاء کرامؑ اپنی قوم سے کہتے کہ جو کچھ ان کے خدا نے ان کی طرف نازل کیا ہے اسے ضابطۂ زندگی بنائیں تو وہ اس کے جواب میں کہتے کہ ہمارے نزدیک صحیح مسلک وہ ہے جو ہمارے آبا و اجداد سے متوارث چلا آرہا ہے ہم اسے چھوڑ کر تمہاری بات ماننے کیلئے تیار نہیں۔ وہ لوگ رسول کو تو یہ جواب دیتے اور دوسرے لوگوں کو رسول کی بات نہ سننے کے لئے کہتے کہ اس کے پاس نہ جانا یہ تو رجل مسحور (یعنی مخبوط الحواس) ہے۔ قرآن نے ان کی اس

روش کا بار بار ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ غور کرو کہ کسی مسلک کے سچے یا جھوٹے ہونے کی یہی دلیل ہو سکتی ہے جو وہ لوگ پیش کیا کرتے تھے؟ قرآن نے حضرت نوحؑ سے یہی کہا اور رسول اللہ صلعم تک تمام اقوام سابقہ کی مذکورہ صدر روش کا ذکر کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت سے لیکر آج تک بھی وہی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے جو اس سے پہلے ہوتا تھا۔ آج بھی جب کسی سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے قرآن میں یہ حکم دیا ہے تو اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ کیا جو کچھ تیرہ سو برس سے ہوتا چلا آیا ہے وہ سب غلط ہے؟ اور دوسروں سے یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن کی طرف بلانے والے سب مخبوط الحواس ہیں۔ طلوع اسلام نے اپنی سابقہ اشاعت میں قرآنی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ یتیم پوتا اپنے دادا کی وراثت سے محروم نہیں ہو سکتا اس کے جواب میں منکرین قرآن کی طرف سے جو جواب شائع ہوا وہ ملاحظہ فرمائیے:

> میں نے پوتے کی وراثت کے معاملہ میں تمام دلائل بیان کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ صرف اختصار کے ساتھ یہ بتایا تھا کہ اس مسئلے میں جذبات کی بنا پر فیصلہ کرنے کے بجائے اگر معقول اصولوں کی بنا پر غور کیا جائے تو جو کچھ فقہا نے بالاجماع رائے قائم کی ہے وہی سراسر معقول معلوم ہوتی ہے۔ میرے بیان کردہ دلائل پر مزید بہت سے دلائل کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر خصوصیت کے ساتھ جو بات اس معاملہ میں سب سے زیادہ وزنی ہے وہ یہ ہے کہ سلف سے لیکر خلف تک تمام امت کے اہل علم اس پر متفق رہے ہیں۔ ایسے متفق علیہ مسائل کا متفق علیہ ہونا ہی بجائے خود اپنے اندر اتنا وزن رکھتا ہے کہ کوئی معقول آدمی ان سے اختلاف کی اسوقت تک جرأت نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے پاس دلائل کی کوئی بڑی غیر معمولی طاقت نہ ہو۔ اور یہاں حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے اختلاف کی جرأت کی ہے ایک طرف تو ان کے دلائل ایسے قوی نہیں ہیں کہ ان کی بنا پر امت کے ایک متفق علیہ مسئلے میں تغیر کیا جا سکے اور دوسری طرف وہ قریب قریب سب کے سب کچھ ایسے ٹیڑھے ذہن کے لوگ ہیں جو ہر دینی مسئلے میں ہمیشہ ایک نرالی اینچ کی بات نکالا کرتے ہیں ان کی بات اگر مانی جائے تو ہمیں گویا یہ ماننا پڑیگا کہ اسی ایک مسئلے میں نہیں بلکہ پورے دین کے سمجھنے میں پہلی صدی سے لیکر آج تک ساری امت غلطی کرتی رہی ہے اور دین کو اگر سمجھا ہے تو صرف اس دور کے تین چار آدمیوں نے سمجھا ہے۔ اس طرح کے خبطیوں کی بات آخر کس التفات کی مستحق ہو سکتی ہے؟

(سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ ترجمان القرآن بابت جون جولائی ۱۹۵۲ء)

دیکھئے اس جواب میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ قرآن کی رو سے فلاں بات صحیح ہے اور فلاں غلط۔ کہا وہی گیا ہے جو اس سے پیشتر کہا جاتا رہا ہے یعنی یہ کہ صحیح وہ ہے جو ہمارے آبا و اجداد کے وقت سے ہوتا چلا آ رہا ہے اور جو خداوندی کی طرف بلانے والے مخبوط الحواس ہیں۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریف پنجہ فگن نئے ۔۔۔ وہی فطرت اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری

---

(۳) مذہبی جنون

مرحوم لیاقت علی خاں کی واردات قتل کے سلسلہ میں جو تحقیقاتی کمیشن بٹھایا گیا تھا اس نے اپنی رپورٹ میں ایک ایسی بات لکھی ہے جو گہرے غور اور فکر کی محتاج ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سید اکبر نے وزیر اعظم کو شاید اسلئے قتل کر دیا ہو کہ مقتول قاتل کے معیار کے مطابق پکا مسلمان نہ ہو۔ اگر اس میں کوئی شائبہ صداقت ہے تو یہ ایک ایسی بات ہے جو اس کی مقتضی ہے کہ ہم رک جائیں اور سوچیں اور دلوں کی گہرائیوں تک دیکھیں اسلئے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طبقہ سے سید اکبر متعلق تھا ان کے نزدیک مذہبی تصور ہر وقت اس امر کا محرک ہو سکتا ہے کہ کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو اس لئے قتل کر دے کہ اس کے مذہبی تصورات دوسرے شخص سے مختلف ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس قسم کے عقیدہ میں یقیناً کہیں نہ کہیں کوئی غلطی موجود ہے ورنہ اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ اس ملک میں جس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ ایک اسلامی مملکت ہے کسی مخلص مسلمان کے لئے کسی دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو جانا اسی طرح ممکن ہے جس طرح کسی باؤلے کتے یا سانپ سے ڈسا جانا۔ اس قسم کے عقیدہ کا امکان اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مذہب اسلام کو جس پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے نہایت غلط طور پر سمجھا جا رہا ہے اور نگاہیں اصل اور بنیاد پر نہیں بلکہ ظواہر اور جزئیات پر ہیں۔ اگر یہ عقیدہ کہ ایک شخص جو مذہب کے ظواہر کا پابند ہے اسے حق پہنچتا ہے کہ ہر اس شخص کو جو اس کے معیار پر پورا نہیں اترتا قتل کر دے اور یہ سمجھے کہ اس نے ایک بہت بڑا فریضۂ خداوندی ادا کیا ہے جس کا اسے ثواب ملیگا تو اس سے مملکت اور معاشرہ دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ (ڈان۔ ۱۰ر اگست ۱۹۵۲ء)

اس میں کوئی کلام نہیں کہ کمیشن نے جس انسانیت کش اور ہلاکت انگیز غلط مذہبیت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ہر اس شخص کے لئے اپنے اندر دعوت غور و فکر رکھتی ہے جس کے دل میں انسانی زندگی کا تھوڑا سا بھی احترام ہے۔ اگر انسان محض اختلاف عقیدہ کی بنا پر قتل ہونے لگ جائیں تو وہ سوسائٹی یا سلطنت درندوں کا بھٹ بن جائیگی لیکن اس بدبختی کا کیا علاج ہے کہ ہمارے عجمی اسلام میں جس کی علمبردار ہمارے ملاؤں کی جماعت ہے یہ عقیدہ موجود ہے کہ مرتد واجب القتل ہے اور مرتد سے مفہوم صرف وہی شخص نہیں جو ترک اسلام کا اعلان کر کے کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے بلکہ ہر وہ مسلمان مرتد ہے جس کے خلاف کفر کا فتویٰ لگا دیا جائے۔ یہ تو یوں سمجھئے کہ انگریزوں کے عہد میں ملا کے پاس قوت نہیں تھی ورنہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی مسلمان باقی رہ جاتا اس لئے کہ یہاں کوئی فرقہ اور کوئی جماعت ایسی نہیں جس کے خلاف دوسرے فرقے یا جماعت نے کفر کے فتوے نہ لگائے ہوں۔ آپ اصول اور فروع اور روح اور ظواہر پرستی میں امتیاز کر رہے ہیں اور ملا کے نزدیک کیفیت یہ ہے کہ "یا رسول اللہ" کہہ دینے والا بھی (ایک فرقہ کے نزدیک) کافر ہو جاتا ہے۔ جہاں اس قسم کی جزئیات پر کفر کے فتوے لگ سکتے ہوں وہاں کس شخص کی زندگی محفوظ رہ سکتی ہے۔ اس باب میں قدیم اور جدید کا کوئی فرق نہیں۔ مرتد کو قتل کر دینے کے بارہ میں ماڈرن ملا بھی ایسا ہی سخت ہے جیسا پرانا ملا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ حال ہی میں امیر جماعت اسلامی کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی جس میں لکھا گیا تھا کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ طلوع اسلام میں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ عقیدہ ملا کے وضع کردہ اسلام کا ہے اور یکسر قرآن کے خلاف ہے۔ لہٰذا جس ہلاکت انگیز رجحان کی طرف کمیشن نے توجہ دلائی ہے اس کا سرچشمہ ملا کا اسلام ہے جسے وہ فاشزم کے انداز کے پروپیگنڈا کے زور پر پاکستان میں بطور قانونِ مملکت نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اسلام اپنے حقیقی خدوخال میں قرآن کے اندر محفوظ ہے۔ قرآنی نظام کو نافذ کر دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ اس قسم کی جنون انگیزیوں کا کس طرح سد باب کر دیتا ہے۔

باب المراسلات

جمع القرآن

میرپور خاص سے بشیر احمد صاحب سوی جالندھری رقمطراز ہیں:

رسالہ طلوع اسلام کے اگست و ستمبر ۱۹۵۲ء کے خصوصی مقالہ "جمع قرآن" میں حضرت علامہ تمنا عمادی مدظلہ نے ایک ایسا خیال قرآن مجید کے نزول کے متعلق ارشاد فرمایا ہے جس کی تائید قرآن و حدیث سے نہیں ہوتی۔ حضرت موصوف فرماتے ہیں "کوہ حرا پر پہلے پہل شب قدر ماہِ رمضان میں پورے قرآن کا کتابی صورت میں آپ کے سامنے نزول ہوا" (ص ۸۸) اس قول کی تشریح حاشیہ میں اس طرح فرمائی ہے:-

> مطلب یہ ہے کہ کذلک انزلنا یعنی ہم نے اسی طرح جیسا کہ تم (کفار) کہتے ہو جملۃ واحدہ ہی اس کو نازل کیا ہے، تاکہ اس کو تمہارے دل میں ثابت و جاگزیں کر دیں۔ یعنی پوری کتاب آپ کو حفظ ہو جائے مگر پھر ترتیل کا طریقہ ٹھہر ٹھہر کر اتارنے کا اختیار کیا، اس لئے کہ تمہیں "تثبیتِ قلب" تو حاصل ہو گئی یعنی اس کو ہم نے تمہارے دل میں ثابت و محفوظ تو کر دیا۔ مگر تمہیں مسائل کے جواب کی تلاش میں زحمت نہ ہو ہر مسئلہ کے موقع پر اس کے مناسب آیت کے نزول سے تمہیں غور و خوض اور آیات کی جستجو نہ کرنی پڑے۔ غرض رسول اللہ صلعم کے ذاتی علم کیلئے ایک بار مکمل نزول شروع شروع ہوا اور ہر سال ایک بار ہو جایا کرتا تھا اور وفات کے سال دو بار ہوا مگر تعلیم و تبلیغ کیلئے نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت نزول ہوتا رہا۔ (حاشیہ صفحہ ۸۸ - ۸۹)

اس تشریح کے مطابق حضرت علامہ موصوف کے نزدیک مکمل قرآن کا نزول دو دفعہ ہوا۔ ایک دفعہ بعثت کے ساتھ ہی عرضِ جبرئیلی کے موقع پر اور پھر اس کے بعد پورے قرآن کا اعادہ ہر سال ہو جاتا تھا۔ دوسری دفعہ نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا حسب ضرورت بغرض تبلیغ و تعلیم ہوا، جو ۲۳ سال میں مکمل ہوا۔

حضرت موصوف کا یہ خیال نیا معلوم ہوتا ہے۔ مفسرین و محدثین صرف اس قدر کہتے ہیں کہ شب قدر میں ایک دفعہ سارا قرآن لوحِ محفوظ سے اول آسمان (یا آسمانِ دنیا) پر نازل ہوا پھر حسب موقع مناسب حصہ حضرت جبرئیل آنحضرت صلعم کے پاس لاتے رہے۔ یہاں تک کہ قرآن کا نزول مکمل ہو گیا۔ مگر حضرت علامہ کے عقیدہ کی رو سے یہ ماننا پڑیگا کہ آنے والے ۲۳ سال کے واقعات جو قرآن میں مذکور ہیں ان کا علم تفصیلی قبل از وقت آنحضرت صلعم کو بعثت کے ساتھ ہی دیدیا گیا تھا اور حضرت نبی اکرمؐ کی حیثیت ان واقعات کے وقوع کے وقت بالکل منفعلانہ تھی۔ چند مثالیں قابلِ غور ہیں۔

(۱) آنحضرتؐ کا ایک حرم محترم کے کہنے پر حلال چیز کا حرام کر لینا اور اللہ تعالیٰ کی اس فعل پر تنبیہ۔ یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک تبتغی مرضات ازواجک (تحریم) قبل از وقت حفظ قرآن نے کیا فائدہ دیا؟

(۲) حضرت زیدؓ اور حضرت زینبؓ کا معاملہ۔ واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ امسک علیک زوجک واتق اللہ وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس (احزاب) کیا آپ کا حضرت زیدؓ کو طلاق دینے سے روکنا (معاذ اللہ) ریاکارانہ تھا جبکہ آپ کو نتیجہ پہلے ہی معلوم تھا۔

(۳) عبس وتولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ وما یدریک لعلہ یزکیٰ (عبس)

(۴) عفا اللہ عنک لم اذنت لھم حتیٰ یتبین لک الذین صدقوا وتعلم الکذبین (توبہ) ایک شخص کو ایک واقعہ کا علم ہو اور وہ جان بوجھ کر انجان بنے یا لغزش کھائے تو یہ صورت اس کے سیرت کی بلندی کو ظاہر نہیں کرتی۔

(۵) قد سمع اللہ قول التی تجادلک فی زوجھا وتشتکی الی اللہ واللہ یسمع تحاورکما ان اللہ سمیع بصیر۔ الذین یظٰھرون منکم من نسائھم ما ھن امھاتھم الخ (مجادلہ) اس سے لازم آتا ہے کہ رسول اللہ صلعم نے قبل از وقت قرآن کا علم رکھنے کے باوجود ظہار کے معاملہ میں عرب کے جاہلانہ رواج کے مطابق فتویٰ دیا۔ (نعوذ باللہ)

کفار کے قول "سارا قرآن کیوں نہ ایک بار اتارا" کے جواب میں کذلک کا کلمہ ان کے قول کو صحیح قرار دیتا ہے یعنی "بات یونہی ہے تمہاری توقعات کے خلاف سارا قرآن ایک بار نہیں اتارا گیا۔ ساتھ ہی اس کی وجہ بھی بیان کردی گئی لنثبت بہ فوادک ورتلنہ ترتیلا (فرقان)

حضرت علامہ نے جمع قرآن عہد نبوی میں نہایت قوی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اگر ان کی متذکرہ صدر دلیل نظر انداز بھی کردیجائے تو باقی دلائل کی قوت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ واللہ اعلم بالصواب

نوٹ:- ہم محترم بشیر احمد صاحب سے متفق ہیں کہ یہ خیال درست نہیں کہ قرآن پہلے پورا کا پورا ایک مرتبہ رسول اللہ کو دیدیا گیا تھا اور پھر وہی قرآن نجماً نجماً ۲۳ سال کے عرصہ میں نازل ہوتا رہا۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کے لئے کسی تفصیلی گفتگو کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک خدا، جبریل، وحی اور قلب محمدی کا صحیح صحیح تصور سامنے نہ آئے اس قسم کی گفتگو مفید مطلب نہیں ہو سکتی۔ محترم پرویز صاحب نے وعدہ فرمایا ہے کہ جب وہ معارف القرآن میں "قرآن" کے متعلق لکھیں گے تو ان عنوانات پر گفتگو کریں گے۔

علامہ تمنا صاحب کا خاص موضوع تنقید روایات اور اسماء رجال ہے اور اسی نہج سے ان کا مقالہ قابل قدر چیز ہے۔ مضمون کے باقی حصوں میں کئی ایک گوشے ایسے ہیں جن میں اختلاف کی گنجائش ہے۔

(طلوع اسلام)

نقد و نظر

(۱) اسلام کی بنیادی حقیقتیں

جیسا کہ طلوع اسلام میں کئی بار لکھا جا چکا ہے اس وقت ہماری تہی دامنی (بلکہ یوں کہئے کہ ذہنی انتشار اور فکری پراگندگی) کا یہ عالم ہے کہ تمام عالمِ اسلامی میں کسی زبان میں کوئی کتاب ایسی نہیں (ہمارا مطلب انسانی تصنیف سے ہے) جسے ہم یہ کہہ کر کسی کے سامنے پیش کر سکیں کہ اسلام وہ ہے جو اس میں لکھا ہے۔ اسی سے ظاہر ہے کہ کسی ایسی کتاب کی کس قدر ضرورت ہے جو یہ بتا سکے کہ اسلام کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کوئی ایسی کتاب سننے میں آتی ہے جس کا دعویٰ یہ ہو کہ وہ اسلام کو پیش کرتی ہے تو ہم والہانہ اس کی طرف لپکتے ہیں۔ لاہور میں ایک ادارہ ہے (INSTITUTE OF ISLAMIC CULTURE) یعنی ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ اس کی طرف سے ایک کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے "اسلام کی بنیادی حقیقتیں"۔ اس سے پہلے اسی ادارہ کی طرف سے (خود ادارہ کے ڈائرکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے قلم سے لکھی ہوئی) ایک کتاب ..... "ISLAMIC IDEOLOGIES" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ جس پر طلوع اسلام میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ وہ کتاب ایسی مایوس کن تھی کہ اس کے بعد اس ادارہ کی طرف سے شائع شدہ کوئی کتاب بھی ہمارے لئے وجہ جاذبیت نہیں ہو سکتی تھی لیکن چونکہ زیرِ نظر کتاب ادارہ کے چار ارکان کی مشترکہ کوشش کا نتیجہ تھی اسلئے اسے دیکھ لینا ضروری سمجھا گیا۔ اور ہمیں افسوس سے کہنا پڑا کہ اس نے ہماری مایوسی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ کتاب کا عنوان ہے "اسلام کی بنیادی حقیقتیں" لیکن اس کی صورت یہ ہے کہ بنیادی حقیقتیں تو ایک طرف، ان ہر چہار ارکان میں سے کسی کی ایک بات دوسرے سے نہیں ملتی۔ ان میں سے ایک صاحب نے کسی گرجا کی عمارت پر لکھا دیکھا کہ (GOD IS LOVE) "خدا محبت ہے" تو انھوں نے اپنی تحقیق کا نتیجہ ان الفاظ میں ثبت فرما دیا کہ

اگر پوچھا جائے کہ ان لاتعداد انبیاء کی تعلیم کا ماحصل یا روح یا نچوڑ کیا تھا۔ تو ہم ایک لفظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ

محبت

اسلام محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ (ص۲)

ایک دوسرے محقق (ALLAN GRANT) کی کتاب (EVOLUTION OF THE IDEA OF GOD) "خدا کے تصور کے ارتقائی مدارج" سے ایسے متاثر ہوئے کہ انھوں نے تحریر فرما دیا مذہب بھی ابتداءً کائنات کے ناقص تصورات اور توجیہ اور تعلیل کے غیر حکیمانہ طریقوں سے شروع ہوا ..... پھر رفتہ رفتہ اس میں ترقی ہوتی گئی ..... یہاں تک کہ جب انسانیت سنِ رشد کو پہنچی تو اس کا مذہب بھی ایک ترقی یافتہ نظامِ فکر کی صورت میں نمودار ہوا۔ جس طرح انسانی شخصیت کے کمال پر اس واقعہ سے کوئی حرف نہیں آ سکتا کہ اس کی ابتداء ایک قطرۂ خون سے ہوئی اور اسے شعور کی ادنیٰ ترین منزلوں سے گذرنا پڑا اسی طرح مذہب

کی صداقت پر اس امر سے کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کہ اس کا آغاز نہایت خام اور ناقص تصورات سے ہوا تھا۔

غور فرمایا آپ نے کہ محقق صاحب نے اسلام کی کس قدر بنیادی حقیقت کا کھوج نکالا ہے لیکن ان کے تیسرے ساتھی اپنے حصۂ مضمون میں فرماتے ہیں کہ

قرآن کی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ آفرینش سے دین اصل میں ایک ہی ہے اور کل انبیاء اور رسل کا یہی دین رہا ہے۔ لوگوں نے کچھ تو جہالت سے کچھ باہمی بغض وحسد سے باتباع نفس اس میں شاخسانے نکالے۔

پوری کتاب پر تبصرہ ہمارے بس کی بات نہیں اس لئے کہ اونٹ کی طرح اس کی کوئی کل سیدھی نظر نہیں آتی۔ بنابریں ادارہ کے رکن اعلیٰ خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے مقالہ بعنوان "اساس اسلام" کے چند نکات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

خلیفہ صاحب فرماتے ہیں

مسلمان جس چیز کو ازلی اور ابدی اسلام سمجھے ہوئے ہیں اس میں کئی قسم کی چیزوں کی آمیزش ہے۔ اس میں اسلام کے ازلی اصول بھی ہیں اور تغیر پذیر فروع بھی۔ قرآن کریم میں بھی کچھ وسیع اور بنیادی اصول ہیں جو ازلی اور ابدی دین ہے اور کچھ وقتی اور جزئی احکام ہیں۔

لیجئے خلیفہ صاحب کی تحقیق کی رو سے مسلمانوں نے قرآن کے ایک حصہ سے تو چھٹی پائی جو ان کے نزدیک وقتی احکام پر مشتمل ہے۔ اس کی تفسیر میں خلیفہ صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں کہ

اسلام اسی حالت میں ایک زندۂ جاوید اور عالمگیر مذہب رہ سکتا ہے کہ اس میں اصول کو اوامر سے الگ کر کے دیکھا جائے۔

یعنی ان کے نزدیک قرآن کے اصول تو زندۂ جاوید اور عالمگیر حیثیت رکھتے ہیں لیکن اس کے اوامر (احکام) وقتی تھے جو مدت ہوئی ساقط العمل ہو چکے ہیں اور اب محض تبرکاً قرآن میں موجود ہیں۔

اس کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوگا کہ وہ اصول کون سے ہیں جو ازلی اور ابدی دین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سو اس کی تشریح بھی سُن لیجئے۔ فرماتے ہیں:

حال ہی میں سویڈن سے ایک مشہور اخبار کا نمائندہ پاکستان میں فقط اس غرض سے آیا کہ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ اسلام کا نظریۂ حیات کیا ہے؟ اور اس نظریۂ حیات پر کس طرح ایک ترقی پسند اور مہذب ومتمول مملکت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ وہ مجھ سے ملا اور مجھ سے کہا کہ میں موحد ہوں اور دہریت کو غلط سمجھتا ہوں۔ مغرب کی مادیت ودہریت اور مادی اشتراکیت سے بیزار ہوں۔ میں نے اس کو اسلام کا نقطۂ نظر علم وعمل اور جماعت ومملکت کے بارہ میں سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کو سن کر اس نے کہا کہ ہم جیسے عیسائیوں اور تم جیسے مسلمانوں میں کیا فرق ہے؟

سوال یہ ہے کہ اگر اسلام کے اصول وہی ہیں جن کی رو سے یورپ کے ایک عیسائی اور مسلمان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا تو پھر ان اصولوں کی تحقیقات کے لئے ایک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی ضرورت کیا ہے۔ یورپ کے عیسائی، عیسائیت کے اصولوں کے متعلق بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور وہ اپنا لٹریچر ہر جگہ بانٹتے پھرتے ہیں۔ آپ بھی اسی لٹریچر کی نشر واشاعت میں ان کا ہاتھ بٹائیے۔ بات بالکل

واضح ہے کہ اگر اسلام کی فکر مکمل وہی ہے جس کی علمبرداری کا دعویٰ ایک معمولی عیسائی بغیر قرآن کا مطالعہ کئے بغیر عیسائیت سے کنارہ کش ہوئے اور بغیر مغربی تمدن وطرز حکومت ومعاشرت سے اعلان بغاوت کئے ہوئے کر سکنے کا مجاز ہے تو ـــــ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟ ـــــ پھر وہ کونسی بات ہے جس کے لئے خواہ مخواہ مسلمانوں کے ممالک اور مغربی اقوام میں کشمکش چلی آرہی ہے، کرنے کا کام تو صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کو سمجھا یا جائے کہ یورپ کی عیسائیت عین اسلام ہے اسلئے عیسائیت اختیار کر لینے میں تمہارا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس سے دنیا میں امن قائم ہو جائے گا اور نوعِ انسانی کے اس محسن کو نوبل پرائز مل جائے گا۔

معلوم نہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھ میں بھی (معاذ اللہ) اتنی سی بات کیوں نہ آئی اور وہ کیوں عمر بھر اہل کتاب (یہودیوں اور عیسائیوں) کو اسلام کی دعوت دیتے رہے اور ان سے کہتے رہے

ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً لن یقبل منہ

جو اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اختیار کرے وہ ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

دین کے متعلق خلیفہ صاحب کی ایک تحقیق یہ ہے کہ

اسلام دین کو فطرت قرار دیتا ہے اور فطرت اس کو کہتے ہیں جو ہر جگہ اندر اور باہر جاری وساری ہو۔ ہر چیز کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، لیکن خدا جو حقیقت کلی ہے وہ فرماتا ہے کہ میں ہی ظاہر ہوں اور میں ہی باطن۔ چونکہ خدا کی ذات وصفات میں کوئی تضاد نہیں ہے اسلئے ظاہر و باطن میں بھی کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔

کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ فطرت کی مذکورہ بالا تفسیر کے لئے قرآن کی کونسی سند ہے اور دین فطرت سے مراد کیا ہے؟ ہزاروں حقائق کائنات کی رگ وپے میں پیوست ہیں کیا ان سب کا نام قرآن نے دین رکھا ہے؟

کتاب میں جا بجا آدم کو "خلیفۃ اللہ فی الارض" لکھا ہے اور اس طرح لکھا ہے گویا قرآن کی آیت نقل کر رہے ہیں۔ کیا ہم اتنا دریافت کر سکتے ہیں کہ خلیفۃ اللہ فی الارض کے الفاظ قرآن میں کسی ایک جگہ بھی آئے ہیں؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب لفظ خلیفہ کے معنی ہی نہیں سمجھے ورنہ وہ خلیفۃ اللہ جیسی بے معنی ترکیب کبھی نہ لکھتے لفظ خلیفہ کے معنی ہیں کسی کے پیچھے آنے والا۔ جانشین (Successor) اسی لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفۃ الرسول کہا جاتا تھا۔ بنا بریں خلیفۃ اللہ کے معنی ہوئے "خدا کا جانشین"۔

ایک مقام پر جبر وقدر کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر ہے

مسلمانوں کی دینیات، علم کلام اور ادبیات میں دورانِ انحطاط میں جبر کا عقیدہ مسلمات میں تسلیم کیا جانے لگا۔

کیا اس دعوے کے اثبات میں کوئی تاریخی ثبوت بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ جبر کا عقیدہ مسلمانوں کے دور انحطاط کی یادگار ہے اور وہ بھی مسلمہ کی حیثیت سے؟ باقی رہا مسئلہ جبر وقدر سو اس کے متعلق مقالہ نگار نے قرآن سے صرف ایک دو ایسی آیات نقل کر دی ہیں جو ان کے مطلب کے مطابق تھیں اور ان آیات کا ذکر ہی نہیں کیا جو ان کے منشاء کے خلاف جاتی تھیں تحقیق کا طریقہ یہ تھا کہ ان تمام آیات کو بھی سامنے لایا جاتا جن سے جبر کے قائل اپنے مطلب کو صحیح ثابت کرتے ہیں اور ان آیات کی آیاتِ قدر سے تطبیق کی صورت بتائی جاتی۔

یہ ہیں بہرحال چند نمونے اس کتاب کے جسے "اسلام کی بنیادی حقیقتیں" کہہ کر منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس قسم کی تصنیفات سے اسلام کا کیا سنورتا ہے اور ملت کا کونسا بگڑا ہوا کام بنتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ اگر اسلام کی بنیادی حقیقتیں یہی ہیں جو اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں تو کیا اس اسلام کو یہ دعویٰ کرنے کا حق پہنچتا ہے کہ میری تعلیم دنیا میں بے مثل و بے نظیر ہے؟

---

(۲) خوشحال خان خٹک

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں دو ایک مقامات پر خوشحال خاں خٹک کا تذکرہ کر کے ہر صاحب ذوق کے دل میں یہ آرزو پیدا کر دی کہ وہ خٹک کے متعلق کچھ زیادہ معلوم کر سکے۔ لیکن اردو زبان میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جس سے کسی کی یہ آرزو پوری ہو جاتی۔ دوست محمد خاں صاحب کامل (ایم۔اے۔ ایل۔ایل۔بی۔ ایڈووکیٹ پشاور) نے چار سو سے زائد صفحات کی زیرِ نظر کتاب میں خوشحال خاں خٹک کا تفصیلی تعارف اس انداز سے کرایا ہے کہ اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

خٹک کی سیاسی زندگی تو اتنی ہی ہے کہ وہ سرحد کے علاقہ میں شاہجہاں کے عہد میں منصب دار تھا۔ اس کے بعد جب اورنگزیب تخت نشین ہوا تو اس نے کابل کے گورنر کی رپورٹ پر خٹک کو قید کر دیا۔ قید سے رہائی کے بعد خٹک نے باقی ساری عمر اورنگزیب کے خلاف جنگ و پیکار میں گذار دی اور اس کے لئے وہ افغانوں کو مغلوں کے خلاف اُبھارتا رہا۔ لہٰذا اس کی تمام تگ و تاز کا محرک جذبہ کوئی بلند مقصد نہ تھا بلکہ ذاتی انتقام تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا تھا اور اس کی ذات پر جو ظلم ہوا تھا اس کا بدلہ اورنگ زیب سے لینا چاہتا تھا چنانچہ وہ بار بار لکھتا ہے کہ اگر اورنگ زیب اس کے ساتھ یہ کچھ نہ کرتا تو وہ مغلوں کی خدمت گزاری میں اسی طرح اپنی زندگی وقف کئے رکھتا جس طرح اس نے شاہجہاں کے وقت میں وقف کی تھی۔ اس لئے ہم اس باب میں محترم مصنف کی اس رائے سے متفق نہیں ہو سکتے کہ خوشحال خاں خٹک کا

> نسلی برتری کے احساس اور اس کے نتائج کو مٹانے کے لئے سرگرم عمل ہونا اپنی اور اپنی قوم کی عزت و شان کے تحفظ اور حصول آزادی کیلئے لڑنا ایک ایسا اولوالعزمانہ کارنامہ ہے جس کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ ایک مسلمان بادشاہ سے اس لئے برسرِ پیکار ہوا تھا کہ اس کی مملکت میں بعض ظالم صوبیداروں نے اندھیر مچا رکھا تھا۔ وہ مسلمانوں کی مملکت میں عدل اور اسلام کی روشنی دیکھنا چاہتا تھا۔

حالانکہ وہ خود ہی دوسری جگہ یہ بھی لکھ چکے ہیں کہ

> خوش حال خاں ایک دنیادار آدمی تھا اور دنیوی اغراض و مقاصد کے حصول کے لئے اباً عن جدٍ بادشاہانِ مغلیہ کی خدمت کرتا چلا آ رہا تھا۔

یہ تو ایک ضمنی سی بات تھی۔ خٹک کی حقیقی عظمت اس کے علمی کارنامے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خٹک نے اپنے گاؤں ہی کے کسی مکتب میں تعلیم پائی تھی۔ وہ ایک منصب دار کا بیٹا تھا اور اس کی تمام عمر جنگ و پیکار میں گذر گئی لیکن جب ہم اس کی شاعری پر نگاہ ڈالتے

ہیں تو اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ وہ فی الواقعہ ایک فطین (Jenius) شخصیت تھی اسے اس قدر بلند نگاہ اور بلکہ شاعری مبدأ فیض کی طرف سے بطور موہبت عطا ہوا تھا کہ بعض مقامات پر وہ اقبال کا پیش رو دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً وہ ایک قطعہ میں کہتا ہے :

جہان کوئی تھوڑے نہیں	مگر اے نادان تو انھیں دیکھ نہیں رہا
دیکھ ایسی کئی زمینیں ہیں اور ایسے کئی آسمان	جو سب تیرے دل میں سمائے ہوئے ہیں
اے عرش سے بزرگ تر انسان !	

ایک غزل کے چند اشعار کا ترجمہ یہ ہے۔

آئینہ سکندر ہو کہ جام جم	درویش کے دل کو نہیں پہنچتے۔
درویش کے آگے بادشاہی کا سر نیچا نہیں	آسمان کی گردن بھی اس کے آگے جھکی ہوئی ہے۔
درویش کا علم درس اور مکتب کا نہیں	اس کی نظر ہمیشہ لوح و قلم پر ہوتی ہے۔

اور دیکھئے۔ کہتے ہیں۔

درویش کے لوح دل پر ساری کتاب لکھی ہوئی ہے	اگرچہ زبان سے اس نے عربی لغات نہیں سیکھ رکھے۔
اگر دیکھو تو عشق وہ عظیم بادشاہ ہے	کہ اس کے بھکاری سلاطین سے بھی زیادہ محتشم ہیں
شاہسواران عشق کو حقیر نظروں سے نہ دیکھو	کہ وہ بے زر و لشکر جاہ جمشید رکھتے ہیں۔

اسی ضمن میں کچھ منتشر اشعار بھی سن لیجئے۔ کہتے ہیں :

کہتے ہیں آسمان پر چڑھنے کا راستہ نہیں	میں ہنر سے تیرے لئے یہ راستہ پیدا کر دوں گا۔
پہلے اڑنے کے لئے اچھا اور مضبوط شہپر پیدا کرو	اور اس کے بعد آسمان کی طرف پرواز کرو
زمانہ میں طلب کے موافق حصہ ملتا ہے	بلکہ اس سے بھی بڑھ کر

ایک اور شعر ملاحظہ کیجئے :

یہ سریلا گلا، نغمے اور چہکار بلبل کا حصہ ہیں	انھیں باز کی جانے بلا
باز کب مردہ لاشوں کی ہوس کرتا ہے	یہ تو کوے اور گدھ کا کام ہے
گندی جھوٹی ناپاک ہڈیاں	کتے گیدڑ بھیڑیئے اور سنڈار کھاتے ہیں
شیر کا کام تو	اپنا مارا ہوا شکار کھانا یا صبر کرنا ہے
مارنا، کھانا اور کھلانا بازوئے شاہیں کی شان ہے	اور بل کے اندر لے جانا چیونٹی اور چوہے کا کام ہے
شاہباز کی بلندی پرواز باشے کو کب نصیب ہو سکتی ہے	اگرچہ وہ بھی اپنے ساتھ پیدائشی پر و بال رکھتا ہے۔

غور کیجئے یہ ایک پٹھان سپاہی کے خیالات ہیں۔ ذرا اس نظم کو دیکھئے اور سوچئے کہ یہ ایران کے لالہ زاروں میں لکھی جاسکتی تھی یا سرحد کے کوہساروں میں

پھر یہ بہار کہاں سے آئی ۔۔۔ جس نے ہر طرف ملک کو ایک گلزار بنا دیا
سوسن و ریحان و ارغوان ۔۔۔ یاسمن و نسترن اور نرگس و گلنار
اور دوسرے کئی گلہائے رنگا رنگ موسم بہار میں کھل رہے ہیں ۔۔۔ لیکن سرخ لالہ ان سب میں نمایاں ہے
لڑکیاں مٹھیاں بھر بھر کر پھول گریبانوں میں ڈال رہی ہیں ۔۔۔ اور جوانوں نے اپنی پگڑیوں کو گلدستوں سے مزین کر رکھا ہے۔
اے مغنی تو سارنگی پر کمان چڑھا ۔۔۔ اور ہر ہر تار سے گوناگوں نغمے نکال
اے ساقی آ اور مجھے بھر بھر کر پیالے دے ۔۔۔ کہ میں مستی مے میں سرشار ہو جاؤں۔

اس تشبیب کے بعد گریز ملاحظہ کیجئے۔

افغان نوجوانوں نے پھر اپنے ہاتھوں کو سرخ کر لیا ۔۔۔ جیسے باز اپنے شکار سے پنجے سرخ کیا کرتا ہے۔
سفید تلواریں انھوں نے ہو سے گلگوں کر لیں ۔۔۔ اور اساڑھ کے مہینے میں لالہ زار کھل گیا

شاعری سے ہٹ کر عقائد کی طرف آیئے تو وہاں بھی حیرت ہوتی ہے۔ کہتے ہیں

میں نے قرآن کو مانا ہے جو آسمان سے نازل ہوا ۔۔۔ اور مقالات یونانی کو اوروں کے حوالے کر دیا ہے

ایک دوسرا شعر ہے ؛

یہ شیخ لوگ جو نمازوں اور روزوں کے بدلے جنت مانگتے ہیں ۔۔۔ تو مجھ خوش حال نے مزدوری کی یہ عبادت نہیں سیکھ رکھی۔

ملا کے متعلق کہتے ہیں ؛

جو کوئی کنز قدوری پڑھ لے ملا بن بیٹھتا ہے ۔۔۔ اور ہر حلال و حرام کو اپنے لئے جائز قرار دے لیتا ہے
حالانکہ نہ تو کنز کے دقائق سے واقف ہوتے ہیں ۔۔۔ اور نہ ہی قدوری میں بصیرت رکھتے ہیں
کتابیں سر پر اٹھا کر ملا بن جاتے ہیں ۔۔۔ اور گاؤں گاؤں محلہ محلہ پھرتے اور چوری ٹھگی کرتے ہیں
رشوتیں لے کر شریعت کی جڑیں کاٹتے ہیں ۔۔۔ جھوٹی روایتیں گھڑتے اور اپنے تئیں قاضی جتاتے ہیں۔
مسجد میں آکر پانچ وقت اذان دیں گے ۔۔۔ لیکن اگر زکوٰۃ اور صدقۂ فطر نہ ملے تو مسجد کو ڈھا دیں گے۔

جی تو یہ چاہتا تھا کہ ان کا سارے کا سارا کلام نقل کر دیا جائے جو کامل صاحب نے کمال نوازش اپنی کتاب میں دے رکھا ہے لیکن افسوس کہ عدم گنجائش اس سے مانع ہے لیکن آخر میں ہم اس سیاسی نکتہ کو درج کئے بغیر نہیں رہ سکتے جو خٹک نے اپنے عمر بھر کے تجربہ کے بعد ہمیں دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

کابل اور کشمیر ۔۔۔ سب تلوار کی کمائی ہیں
بھروسہ یا خدائے واحد کا ہے یا تلوار کا ۔۔۔ کانفرنسوں اور ڈیپوٹیشنوں سے کبھی کام نہیں بنتا

کتنی بڑی حقیقت ہے جو آج بھی اسی طرح اپنی جگہ پر اٹل ہے جس طرح تین سو سال پہلے تھی جب یہ خوشحال خاں کے قلم کی لکھی گئی تھی اور کتنی دور رس تھی اس شخص کی نگاہ جس نے تین سو سال پہلے ہمارے لئے ایسی تہ کی بات کہدی کہ جس سے وہی قوم انکار کر سکتی ہے جو اپنی بے ہمتی کو مصلحت کوشی کے فریب میں چھپانے کی کوشش کرے۔

ہم محترم کامل صاحب کے تہ دل شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ہمیں خوشحال خاں کے ان بلند خیالات سے مستفید ہونے کا موقعہ دیا۔ اب تو جی چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح پشتو سیکھ ہی لی جائے کیونکہ اب یہ حقیقت کھلی کہ پشتو محض کے کنستر میں روڑے ڈال کر کھڑکھڑانے کی آواز کا نام نہیں بلکہ یہ بلند افکار کی حامل بھی ہے۔

ہم کامل صاحب سے درخواست کریں گے کہ وہ خٹک کے پورے کلام کا انتخاب اردو ترجمے کے ساتھ الگ شائع کریں۔ کسقدر مقام تاسف ہے کہ انگریزوں نے تو اس کلام کو اپنی زبان میں منتقل کر لیا ہو اور ہندوستان و پاکستان کے مسلمان ابھی تک اس سے بے خبر ہوں — کتاب مولف [illegible] سے مل سکتی ہے۔

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن جلد چہارم)

گذشتہ سال کے آخر میں جبکہ بڑھتے ہوئے مالی خسارہ کے پیش نظر طلوعِ اسلام کو بند کرنے کا فیصلہ کیا گیا تو معارف القرآن (معراجِ انسانیت جلد چہارم) کی قیمت میں تین ماہ کے لئے رعایت کر دی گئی تھی تاکہ خسارہ کی تلافی کی کچھ شکل پیدا ہو جائے۔ اس رعایت سے قارئین طلوعِ اسلام نے فائدہ اٹھایا لیکن اس کے باوجود بہت سے حضرات بروقت کتابیں حاصل نہ کر سکے۔ چنانچہ ان کا اسوقت سے یہی تقاضا چلا آرہا تھا کہ انھیں کتابیں رعایتی قیمت پر دی جائیں۔ یہ تقاضے اسے شدید ہو گئے تھے کہ ادارہ کے پاس کوئی چارہ کار نہیں رہا سوائے اس کے کہ ان کے سامنے سپر ڈال دی جائے۔

چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ

معراجِ انسانیت

(معارف القرآن جلد چہارم)

کی قیمت میں پھر

تین ماہ کے لئے رعایت

کر دی جائے۔ یہ رعایت ۱۵ر جولائی سے ۱۵ر اکتوبر تک رہے گی۔

اس دوران میں **معراجِ انسانیت**

بیس ۲۰ روپے کی بجائے بارہ ۱۲ روپے میں مہیا کی جائے گی۔

پیکنگ و محصولڈاک ایک روپیہ چھ آنے بذمہ خریدار

دوکانداروں سے بھی یہی قیمت لی جائے گی ان کے ساتھ مزید کوئی رعایت نہ ہوگی۔

اب چونکہ اس میعاد میں صرف پندرہ روز باقی رہ گئے ہیں اسلئے ضرورتمند حضرات پہلی فرصت میں آرڈر دیدیں۔ ۱۵ر اکتوبر کے بعد اصلی قیمت عـ۲۰ وصول کی جائیگی۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ کراچی

ماہنامہ "فیض الاسلام" راولپنڈی

تفسیر القرآن:۔ جو وحی اور اُس کی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کر کے دل کی گہرائیوں میں سما جائے۔

معارفِ حدیث:۔ جو دین و اخلاق کی حقیقتوں اور صداقتوں کو اجاگر کر کے قرآنی طرزِ انقلاب کی راہیں صاف کر دیں۔

بیانِ تصوف:۔ جو روحانی بصیرت پیدا کر کے اُجڑے ہوئے دلوں کی بستی کو آباد کر دے۔

تاریخی حقائق اور واقعاتِ عالم: جن سے حیات افروز ماضی کی بنیادیں روشن ہوں اور عصرِ حاضر کے تقاضے اور بدلتے ہوئے حالات سامنے آجائیں۔

ادبِ صالح: جو فسق و فجور اور الحادی ادب پر برقِ سوزاں بن کر گرے۔

اگر آپ ان حیات افروز تجلیوں اور زندگی بخش علوم و معارف سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ تو

ماہنامہ فیض الاسلام کا مطالعہ کیجئے

جو انجمن فیض الاسلام کے ماتحت چار سال سے پابندیٔ وقت اور بڑی آب و تاب سے اسلامی علم و ادب کی خدمت کر رہا ہے۔

قیمت سالانہ پانچ روپے۔ فی پرچہ آٹھ آنے

بھارت سے سالانہ چندہ چھ روپے آٹھ آنے۔ فی کاپی دس آنے

پتہ:۔ منیجر ماہنامہ "فیض الاسلام" راولپنڈی (پاکستان)

بھارت والے حسب ذیل پتہ پر چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال کر کے ہمیں منی آرڈر کی رسید بھیجدیں ہم رسالہ جاری کر دینگے۔

بھارت کا پتہ: میسرز بشیر احمد اینڈ سنز کین مرچنٹ۔ لودھی ٹولہ۔ پرانا شہر۔ بریلی۔ بھارت

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ وہ تنہا ادارہ ہے جو گراموفون ریکارڈ کے ذریعے سے نئی زبان سکھاتا ہے۔

زبان وہ سیکھئے
جو اہلِ زبان بولتے ہیں

نصابی کتابوں سے آپ "کوئی غیر ملکی زبان" بولنے کا صحیح طریقہ نہیں سیکھ سکتے۔ اس کیلئے ضروری ہے آواز کا وہ انداز اور اتار چڑھاؤ اور کلام کا وہ لب و لہجہ جو عموماً روزمرہ کی بول چال میں اہل زبان کام میں لاتے ہیں۔ لنگوافون سے یہ چیزیں بہت جلد پوری طرح اور بغیر محنت و کوشش کے ذہن نشین ہو جائیں گی۔

کوئی زبان سیکھنے کیلئے عموماً جتنا وقت درکار ہوتا ہے لنگوافون اس کی نصف مدت میں آپ کو وہ زبان بولنے، پڑھنے اور لکھنے کے قابل بنا دیتا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ دشوار کام یعنی بولی سن کر سمجھ لینے کی مہارت پیدا کر دیتا ہے۔

اس طریقۂ تعلیم میں درس و تدریس کے منجمد قواعد و ضوابط نہیں ہیں بلکہ شروع ہی سے آپ کو روزمرہ بول چال کے ایسے ماحول میں رکھ دیا جاتا ہے جو ٹھنڈی سڑکوں، قہوہ خانوں یا سیر گاہوں میں پایا جاتا ہے۔ صرف پندرہ منٹ روزانہ صرف کیجئے اور چند ماہ میں آپ اپنی دلپسند زبان میں آزادانہ اظہار خیال کر لینے پر قادر ہو جائیں گے۔ زبان سیکھنے کے لئے اس اچھوتے اور جدید طریقے کے متعلق پوری معلومات حاصل کیجئے۔ مندرجہ ذیل کوپن ڈاک میں ڈال دیجئے فوراً تفصیلی جواب دیا جائے گا۔

زبان سیکھنے کے لئے لنگوافون

اردو	انگریزی	فارسی .....
عربی	بنگالی	ہندوستانی .....
فرانسیسی	روسی	چینی .....
اسپینش	اطالوی	ڈچ .....
سویڈش	ناروجین	فنش .....
زیچ	پولش	لاطینی .....
یونانی	ایفک	ملائے .....
ہوسا	آئس لینڈک	سواحلی .....
جرمن	ترکی	پرتگالی .....

اپنی پسند کردہ زبان کے آگے چوپارہ (×) بنا دیجئے اور نیچے غرض یا وجہ لکھئے۔

زبان سیکھنے کی وجہ یا غرض .....

نام .....

پتہ .....

جنرل سکریٹری صاحب

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ متصل گرانڈ ہوٹل میکلوڈ روڈ کراچی

براہ مہربانی اپنی تفصیلی کتاب جس میں لنگوافون اور سفتہ بھر کی مفت آزمائش کے متعلق وضاحت درج ہے بھیج دیجئے۔

میرے پاس گراموفون باجہ موجود ہے/نہیں ہے

THE ANGLO-THAI CORPORATION LTD.

(Incorporated in England)

(EWART RYRIE BRANCH)

Importers, Exporters & General Merchants

Nadir House, McLeod Road
KARACH

BRANCHES:—

BANGKOK.

SINGAPORE.

BOMBAY.

KUALA LUMPUR.

PENANG.

Agents for:—

Howards & Sons Ltd., Ilford, London —
QUININE SALTS & FINE CHEMICALS.

Stafford Allen & Sons Ltd., London.—
MANAUFACTURING CHEMICALS.

J. R. Geigy, Basle.—*Insecticides.*—
DYES & PHARMACEUTICALS.

Eli Lilly International Corporation, Indianapolis (U.S.A.).—
PHARMACEUTICALS.

H. Bronnley & Co. Ltd., London.—
TOILET REQUISITES.

London Varnish & Enamel Co. Ltd., London.—
PAINTS & VARNISHES Etc., Etc.

Regd. No. S. 1089.

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for

<u>Both</u>

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS
BY PRODUCING

Highly Vitaminised
&
Nutritive Cooking Oil

High Class
Washing Soap which
Cleanses Clothes 'Milky White'

BENGAL OIL MILLS LTD.

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

Telegrams : "BENGALI"

P. O. BOX No. 162
KARACHI-2

Telephone | Office : 3336
Mills : 2008

Only Title Printed at Abbasi Litho Art Press, Frere Road, Karachi and Text Printed at Adbi Press, Robson Road, Karachi, published by Khurshid Alam & issued from Tolu-e-Islam Office, Robeson Road Karachi.